# قرۃ العین حیدر

انڈو پاک کی صف اول کی افسانہ نگار خاتون ہیں ۔صرف ناول ہی پر منحصر نہیں آپ نے ناول نویسی میں وہی شہرت حاصل کی ہے ۔ جو ایک اچھی اور کہنہ مشق ادیبہ ہی کا حصہ ہے ۔

۱۹۲۷ء میں محترمہ قرۃ العین حیدر علی گڑھ میں پیدا ہوئیں آپ اس دور کے معروف قلم کار سید سجاد حیدر یلدرم کی بیٹی تھیں ۔ جو اس وقت مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے ۔

محترمہ قرۃ العین حیدر نے ۱۹۴۷ میں تقسیم ملک کے وقت لکھنو یونیورسٹی کے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی جب کہ زمانہ طالب علمی ہی میں آپ معروف ادیبہ بن چکی تھیں آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز زمانہ طالب ہی میں یعنی ۱۹۴۴ میں کیا جب آپ کی پہلی کہانی اس دور کے معروف جدیدے ''ھمایوں'' میں شائع ہوئی ۔اس کے بعد آپ نے مسلسل لکھا اور قارئین نے آپ کی تحریروں کو اس دور کی بہترین تحریریں مان لیا ۔

آپ کا پہلا افسانوں کا مجموعہ ۱۹۴۷ء میں ''ستاروں کے آگے'' کے نام سے شائع ہوا اور پہلا ناول ۱۹۴۹ء میں ''میرے بھی صنم خانے کے نام سے شائع ہوا آپ نے اپنا دوسرا ناول ۱۹۵۲ میں ''سفینہ غم دل کے نام سے پیش کیا ۔ اور افسانوں کا ایک اور مجموعہ ۱۹۵۴ء میں ''شیشے کے گھر'' کے نام سے منظر عام پر آیا ۔

آپ نے ہنری جیمز کے ایک معروف ناول کا ۱۹۵۸ء میں ''ہمیں چراغ ہمیں پروانے'' کے نام سے ترجمہ بھی پیش کیا جو بے حد مقبول ہوا اور اس کے بعد آپ کا معروف ناول جس نے ادبی حلقوں میں ہلچل پیدا کر دی ''آگ کا دریا کے نام سے ۱۹۵۸ میں شائع ہوا ۔

آپ کی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزی، فارسی، عربی، ہندی، گجراتی، بنگالی اور پنجابی زبانوں میں آپ کے افسانے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ آپ کے مختلف افسانوں کو یکجا کر کے ناشرین نے اور بھی بہت سے مجموعے مختلف نام رکھ کر پیش کیے جو مقبول ہوتے رہے ہیں۔

''آگ کا دریا'' پر آپ کو آدم جی ادبی انعام مل چکا ہے۔ اور ''آگ کا دریا'' پر ایک فلم بھی بن چکی ہے جو بے حد مقبول ہوئی۔۔۔۔۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ قرۃ العین حیدر صف اول کی مضفہ ہیں۔۔۔۔

بلیغ الدین جاوید

جنوری کی برفانی صبح کا کہرہ درختوں پر سے چھٹنے لگا، دور گومتی کے اس پار ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سورج نکل آیا تھا، اور ندی کے ساحل پر بکھری ہوئی سیپیاں چمکنے لگی تھیں، شبرو اشمعلچی باورچی خانے کی چھول داری کے آگے، نم زمین پر اکڑوں بیٹھا سیاہ مسالے والی لمبی تختی پر نہایت فراٹے سے چھریاں صاف کر کے ڈھیر لگاتا جا رہا تھا، اور سردی کم کرنے کے لئے گانے میں مصروف تھا،

تجلّے طور کی موسےٰ کلیما بن کے نکلیں گے
محمدؐ مصطفےٰ محشر میں دولہا بن کے نکلیں گے

پھر اس نے دوسری قوالی شروع کر دی۔

دیکھنا ساقی گھٹا گل جا پہ چھائی نہ ہو

سورج کی روشنی تیز ہوئی، کیمپ میں چہل پہل شروع ہو گئی، آم کے باغ میں اجلاس لگ گیا، دور دور تک کھی تکی منڈیروں کے ساتھ ساتھ یکے، ادھے، بہلیاں اور سائیکلیں کھڑی تھیں، اہل کار، عرضی نویس، محرر، کسان، زمین دار، گواہ، موکل درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، دو کہار ایک ڈولی اٹھائے اجلاس کی سمت آئے، ڈولی درخت کے نیچے رکھ دی گئی، اس کے اندر بیٹھی ہوئی عورت آہستہ آہستہ رونے لگی، مقدمے کی سماعت کا آغاز ہوا، عورت نے اپنا بیان دیا اور پھر وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی،

دوپہر ہو گئی، شیشم کے جھنڈ میں سے ایک ہاتھی نمودار ہوا، اور جھومتا جھامتا کیمپ کی طرف بڑھا، وسط کے بڑے خیمے کے سامنے پیادے نے نیچے اتر کر دوارکا پرشاد کو آواز دی، دوارکا پرشاد پھر میم صاحب کے خیمے کی طرف لپکے،

نواب شمس آرا بیگم کا ہاتھی آوا ہے۔ چھوٹی بٹیا کھاطر۔

واپس کر دو، میم صاحب نے حسب معمول جواب دیا، وہ اس وقت خیمے کے

عقب میں بیٹھیا پنے بیٹے کو آلہ آباد خط لکھ رہی تھی، چھوٹی بٹیا تیر کی طرح دوسرے خیمے سے نکلیں

ماما۔۔ ماما۔۔ ماما۔۔ انھوں نے نے دہاڑنا شروع کیا۔ ہم تو جمبو پر ضرور چڑھیں گے۔ ہم تو جمبو کو امرود کھلائیں گے ----------ماما۔۔ اتنا کہہ کر وہ زمین پر لوٹ گئیں۔

اچھا اچھا زمین پر مت لوٹو،۔۔۔ میم صاحب نے جھنجلا کر جواب دیا اور خط لکھنے میں منہمک ہو گئیں۔

چھوٹی بٹیا نے جھک کر اپنی سرخ جوتیوں کے بکل بند کیے، اور گود میں اٹھائے جانے کے لئے دوارکا پرشاد کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔۔ مدار بخش خدمت گار نے جلدی سے پھول دار ریشمی چھتری لا کر رکھ دی، مہاوت نے ہاتھی گھٹنوں کے بل بٹھا دیا، دوارکا پرشاد بٹیا کو گود میں لے کر ہودے پر فروکش ہو گئے، اور اپنی بڑی بڑی سفید مونچھوں پر بڑے وقار سے ہاتھ پھیرا۔ وہ کلکٹر صاحب کے چپڑاسی تھے، کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا۔ نواب شمس آرا بیگم کا پیادہ ان سے بہت مرعوب نظر آ رہا تھا، گھسی ہوئی زربفت کی جھولی اور منقش ہودے والا ہاتھی اجلاس کے سامنے سے گزرتا پاربتی پور کی گڑھی کی سمت روانہ ہوا۔

عدالت میں ڈولی کے اندر بیٹھی پردہ نشین بی بی کی فریاد جاری تھی۔ ڈولی کے پیچھے تین طرف چھوٹی سی قنات لگا دی گئی تھی، قنات کے اندر ایک چودہ پندرہ سال کی لڑکی ہری چھینٹ کا تنگ پاجامہ پہنے گلابی ململ کا دوپٹہ اوڑھے زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی، اس نے ایک ہاتھ سے ڈولی کا پردہ پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی، کبھی کبھی وہ سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتی تھی،

باہر اجلاس میں اس کا نام بار بار لیا جا رہا تھا۔ قنات کی درز میں سے جھانک کر اس نے باہر دیکھا، ۔ سامنے سے ہاتھی گزر رہا تھا۔ اس پر سنہرے بالوں والی ایک

چھوٹی سی بچی سوار تھی، بچی نے بھالو کی کھال والا بڑے بڑے بالوں والا کوٹ پہنا ہوا تھا، اور ایک سفید مونچھوں والا وردی پوش بڑے میاں نے رنگ برنگی چھتری سے اس پر سایہ کر رکھا تھا، بالکل پریوں جیسی کہانیوں میں ہوتا ہے، ڈولی کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی حیرت سے جھانکتی رہی، یہاں تک کہ ہاتھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔اب وہ سر جھکا کر گیلی مٹی پر ہاتھوں کی انگلی سے تصویریں بنانے میں دوبارہ مشغول ہوگئی، اب کے اس نے ہاتھی کی تصویر بنائی، اس پر ہودے کی چار لکیریں کھینچیں، اور اس میں تاج پہنے ہوئے شہزادی بٹھا دی،

اس نے اپنے آپ سے کہا، یہ شہزادی میں خود ہوں،، میں بسنتی بیگم،۔۔

مسماۃ ثریا سلطان، عرف بسنتی بیگم نابالغ۔۔۔عدالت میں اس کا نام پھر لیا جا رہا تھا۔اس نے سہم کر ڈولی کا پردہ مضبوطی سے پکڑ لیا

ہاتھی گاؤں سے باہر نکلا، آبادی کے سرے پر صدیوں پرانی خانقاہ تھی، اور باؤلی ۔۔اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر مخدوم زادہ شاہ منور علی کا مکان تھا، ہاتھی مکان کے برابر کی گلی میں سے گزرا۔ہودے میں سے چھوٹی بٹیا کو مکان کا کچا آنگن نظر آیا، جس میں لمبی سیاہ داڑھی اور سیاہ کاکلوں والے ایک بزرگ نارنجی رنگ کی کفنی پہنے ایک کھاٹ پر بیٹھے آسمان کو تک رہے تھے، چگی داڑھی اور اداس چہرے والے ایک اور بزرگ مونڈھے پر بیٹھے تھے، امرود کے پیڑ کے پیچھے ایک لڑکی سرخ رنگ کا تنگ پاجامہ پہنے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مسالہ پیس رہی تھی، اس نے چاندی کی میلی میلی چوڑیاں پہن رکھی تھیں، ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

دھوپ تیز ہوگئی، اجلاس لنچ کے لئے برخاست ہو گیا۔لالہ حسین بخش متصدی نے وہ مسل لپیٹی جس میں مسماۃ بوٹا بیگم کی درخواست منسلک تھی،

منکہ مسماۃ بوٹا بیگم، بالغ قوم مسلمانِ، ذات سید، سکنہ موضع محمد گنج تحصیل ہیرو ضلع سلطان پور، بیوہ سید زوار حسین، جنت آرام گاہ، کاشت کار موضع ہذا کی

ہوں، عرصہ تین سال کا ہوا، فدویہ کی اکلوتی دختر سیدہ ثریا سلطان عرف بسنتی بیگم کے واسطے، جس کو اللہ تعالیٰ جل شانہ بیبہ طفیل جناب بتول پاک علیہ السلام دولت حسن صورت وسیرت وعصمت سے مالا مال کیا ہے، نواب سکندر قلی خاں عرف نواب بھورے تعلقہ دار سہر دلی دورگاہ کنڈ نے خواہش کتخدائی کی ظاہر کی۔ فدویہ نے پیغام نا منظور کیا، کس واسطے کہ نواب صاحب موصوف باوجود تعداد کثیر ازدواج منکوحہ منوعہ وغیر منوعہ ہونے کے بعمر ۶۵ سال از حد عادی جملہ فسق وفجور ولہو ولعب کے ہیں۔ بعد چند روز ۲۲ فروری ۱۶۳۷ء چار گھڑی رات گئے بذریعہ پیادگان مسلح اغوا بسنتی بیگم بعمر ساڑھے تیرہ سال عمل میں آیا، اور اس بانوئے معصوم وعفیفیہ کو گڑھی درگاہ کنڈ میں قید کر دیا گیا، نواب شمس آرا بیگم تعلقہ دار پاربتی اس وقت تک فدویہ سے بہت موافق تھیں۔ کس واسطے کہ ممدوحہ نے بعالم طفولیت درس قران حکیم لیا تھا۔ اور فدویہ گڑھی پارسپتی پور میں آتو جی کے عہدے پر مدت مدید تک منصوب رہی۔ علاوہ ازیں شوہر فدویہ کا گڑھی کے ذاکروں میں اہم تھا، اور وہ مرحوم اخیر ایام زندگی تک باوجود فتور بصارت امام باڑہ ممدوحہ میں سوزخوانی کرتے رہے تھے، لہذا بیگم صاحبہ دام اقبالہا نے ازطرف فدویہ رجوع عدالت کیا، اور مقدمہ فوجداری واغوا نواب بھورے پر دائر کر دیا، کہ مابین تعلقہ ہائے ممدوحہ ونواب صاحب موصوف پشت ہا پشت سے سلسلہ مقدمہ بازی بہ وجوہ گوناگوں جاری ہے۔

بعد چند روز بوقت نصف شب نقاب پوش ڈاکوؤں نے غریب خانہ میں کود کر فدویہ کے دریتیم سید کرار حسین سلمہ کو بعمر اٹھارہ سال گنڈاسوں سے شہید کر دیا اور غائب ہو گئے۔

بعد ازاں، عدالت حاکم پرگنہ کے روبرو میاں نوروز صاحب زادہ نواب شمس آرا بیگم نے بیان دیا کہ مسماۃ بسنتی بیگم منکوحہ ان کی ہے، اور اس لڑکی کے وارث وہ خود ہیں۔۔۔ ازبس کہ بوجہ اس شعلہ جدید ورخنہ وفتنہ ثانی کے یہ امر اب از حد نازک

و پیچیدہ ہو چکا ہے، بحکم جناب خلائق پناہ مسٹر رام سرن بھار گوا حاکم پرگنہ مسماۃ بسنتی بیگم بذریعہ پولیس گڑھی درگاہ کنڈ سے نکال کر میری تحویل میں دے دی گئی، مگر اب طاقت میاں نوروز کے دعوے باطل کے مقابلے میں اس اجل گرفتہ میں نہیں ہے، اور فدویہ بحالت افلاس ولاچاری و بے کسی و اضطرار و اندوہ شدید حضور کیواں قدر نوشیرواں وقت ہمایوں شکوہ جناب کلکٹر صاحب بہادر سے فریادی ہے کہ مزید ابواب فساد و آتش افروزی اس ضمن میں بحکم خاص بندہ فرمادیں، اور یہ امر کہ اعانت ارباب استحقاق کی منظور نظر فیض مظہر ہے، باعث ثواب و حسنات اور زیادتی نام و نشان آپ کا ہووئے گا۔

دیگر عرض یہ ہے کہ گواہی میں فدویہ دریں حالات پر آشوب فقط سید مظہر علی کاشت کار سکنہ محمد گنج بخش کو پیش کر سکتی ہے،

جو گو کہ رعیت نواب شمس آرا بیگم کی ہیں۔ مگر بکمال صفات باطن۔۔۔

دھوپ اب اتر کر صحن کی دیوار پر آ چکی تھی، سید مظہر علی اپنے کھیتوں کا ایک چکر لگا کر پھر مونڈھے پر آن بیٹھے، ان کے بڑے بھائی شاہ منور علی مدینہ اخبار سے منہ ڈھانپ کر کھاٹ پر لیٹ گئے۔ سید مظہر علی کی بیبی نے دن بھر دھوپ میں سرخ مرچیں سکھائی تھیں۔ جن کی دھانس سے مظہر علی کو دو تین چھینکیں آئیں---------جھنگا پاسی کی عورت دہلیز میں بیٹھ کر منظور النساء کے سر میں جوئیں دیکھنے لگی۔

منظور النسا کے سرخ طول کے تنگ پاجامے کے پائنچے کیچڑ میں سنے ہوئے تھے ،کیوں کی وہ دن بھر اوسارے کے سامنے گیلی مٹی سے گھروندے بناتی رہی تھی،

شاہ منور علی بے چینی سے پھر اٹھے، اللہ غنی۔۔۔ انھوں نے زور سے نعرہ لگایا۔ مرغیاں کٹ کٹ کرنے لگیں، ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی کھڑکی، اور سید اختر علی اندر داخل ہوئے۔

بھیا لوٹ آئے تحصیل سے۔۔۔۔سید مظہر علی کی بی بی نے کہا،

السلام علیکم، جیتے رہو ----------سید مظہر علی نے کہا، سید اختر علی نیصحن کے کونے میں رکھے ہوئے مرغیوں کے جھولے پر نظر ڈالی۔

میم صاحب نے ڈالی واپس کر دی۔سید مظہر علی نے کہا۔

پورے دس روپے اشرفی لال سے ادھار لے کر ای ڈالی لے گئے رے تمری خاطر۔۔۔۔بھاوج نے ٹاٹ پر سے مرچیں بٹورتے ہوئے فریاداً کہا۔

ہمارے کام کا کیا ہوا۔۔۔سید اختر علی نے ذرا نا گواری سے پوچھا۔۔۔

ہم ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط لے کر اجلاس سے قبل کلکٹر صاحب سے ملے تھے ،انھوں نے کہا ہمیں سفارت کی کوئی ضرورت نہیں ،لکھنو درخواست بجھوا دیجیئے ۔ہم جانسن صاحب سے بات کر لیں گے،

جانسن صاحب شام کو پہنچیں گے ۔کل سویرے ہی شکار کے لئے چلے جائیں گے ۔ہم کیمپ سے سب معلوم کرتے آئے ہیں۔

دو روپے لالہ حسین بخش کی نذر کیے۔۔۔

میم صاحب انگریز ہیں نا ----------سید مظہر علی نے دریافت کیا۔

دادا انگریز تھے ۔مرزا پور میں نیل کی کاشت کرتے تھے،نواب صاحب وکرم پور کی لڑکی سے شادی کر لی تھی ۔کلکٹر صاحب بہار کے کسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں ۔میم صاحب کو میکے سے زمینداری ملی ہے ۔آلہ آباد اور میسوری میں کوٹھیاں ہیں ۔دو لڑکے ہیں۔سید اختر علی نے جواب دیا۔

اللہ کی شان ہے ۔وہ پاک پروردگار بعضے لوگن کو دنیا کی ہر نیامت عطا کرت ہے ۔ بھاوج نے سوپ میں ارہر کی دال پھٹکتے ہوئے قناعت سے اظہار خیال کیا۔ خاموشی چھا گئی۔

خداوند تعالیٰ عاشق کو بہت لمبی جائیداد عطا کرتا ہے ۔صبر کی جائیداد۔

شاہ منور علی نے دفعتاً کہا اور اٹھ کر باہر چلے گئے ۔ اور سنسان گلی میں سے گزرتے ہوئے درگاہ کی منڈیر جا بیٹھے ۔۔

بھائی صاحب نے بھی تمہارے لئے اتنے چلے کھینچے، کچھ نہ ہوا،

سید مظہر علی نے آہستہ سے کہا ۔۔ پچھلے سال چھ مہینے تک گرمتی کنارے کئی میں پڑے، چلے کے جاڑے تھے، نمونیہ ہوگیا، منظور یا حقہ لے آؤ بیٹا۔

انہوں نے لڑکی کو آواز دی۔ اس نے حقہ تازہ کر کے باپ کے سامنے لا رکھا۔

سید مظہر علی نے جو باپ کے سامنے حقہ نہ پیتے تھے ۔ اب ایک کش لگایا ۔ اور بات جاری رکھی ۔ ہم بہت ہاتھ پیر جوڑ کر گھر واپس لائے ۔ آج کل جناتوں کو قابو کرنے کا عمل کر رہے ہیں ۔ ہم نے کلکٹر صاحب سے تمہارے لئے کہا، ہمارا چھوٹا بھائی وکیل ہے مگر قسمت کا ہیٹا ہے، ضلع کچہری میں وکالت کی مگر وہاں نہیں چلی، کان پور میں پریکٹس شروع کی وہاں فاقوں کی نوبت آ گئی ۔ اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا ہے، سنا ہے لکھنو سکتر صاحب کے دفتر میں ایک ملازمت خالی ہوتی ہے ۔ اگر حضور کرم گستری فرما کر اس کی سفارش کر دیں ۔ وہ کہنے لگے سید صاحب ہم کس قابل ہیں ۔ اللہ پر بھروسہ رکھیے ۔ وہ دیر یا سویر سب کی سنتا ہے ۔

اب ہم تیرہ تیزی کے مہینے میں سندیلے جا کے شاہ مدار کے مزار پر چادر چڑھتبا جبھی تم کا نوکری ملے، بھاوج نے سوپ دیوار پر ٹانگتے ہوئے کہا ۔۔۔

سید اختر نے بے زاری سے بھاوج کی طرف دیکھا اور گھڑونچی کی طرف نظر دوڑائی ۔ بھاوج لپک کر گئیں ۔ اور جگر جگر کرتے مرادی بادی کٹورے میں گھڑے سے یخ ٹھنڈا پانی انڈیل کر دیور کو پیش کیا، وہ دیور سے ماں کی طرح محبت کرتی تھی ۔

سید مظہر علی نے ڈرپلی ٹوپی سر پر رکھی اور کھڑاواں پہن کر عصر کی نماز کے لئے مسجد چلے گئے ۔ سید اختر علی نے مدینہ اخبار لپیٹ کر حقے کی نے اپنی طرف کر لی ۔ کیوں کہ وہ بھی بڑے بھائی کے سامنے حقہ نہیں پیتے تھے ۔ دو ر درگاہ کے منڈیر پر

سے شاہ منور علی نے یا بدوح کا دل ہلا دینے والا نعرہ بلند کیا۔ اس وقت اس مکان اور اس فضا پر ایسی اداسی طاری تھی کہ کلیجہ پھٹتا تھا۔

باہر باؤلی کے نزدیک نیم تلے پھڑ جمی تھی۔ نواب بھورے کا بھتیجا منن خاں جو ڈاکوؤں میں مل گیا تھا۔ بستی کے چند بے فکروں کے ساتھ بیٹھا چوسر کھیل رہا تھا۔ اور پانسہ پھینکتے ہوئے بار بار جمشید کو چڑا رہا تھا۔

مرغان چمن دیتے ہیں جا جھیل میں انڈے
مخار لوگ دیتے ہیں تعطیل میں انڈے

جمشید علی ایک طرف کواکڑوں بیٹھا بے دلی سے کھیل دیکھ رہا تھا۔ جب منن خاں نے تین چار بار اس کے باپ کی بے روزگاری پر اس طرح چوٹ کی تو غم و غصے سے بھنا کر اس نے منن کو ایک تھپڑ رسید کیا، بساط الٹ دی اور باؤلی کی نالیاں پھلانگ کر لمبے لمبے قدم رکھتا خانقاہ کی طرف چلا گیا۔

کھنڈر کے پیچھے چھپ کر اس نے چھینگلیا سے پلکیں صاف کیں۔ اور سامنے دیکھنے لگا، نرکٹ کی باڑ کے نیچے قبرستان تھا۔ جس میں ادھر ادھر روئی کے چند پیڑ کھڑے تھے۔ اور روئی کے سفید سفید پھول سارے میں بکھرے ہوئے تھے۔ قبروں کے چاروں طرف اونچی اونچی گھاس تھی۔ اور خاردار جھاڑیاں اور ناگ پھنی اور کروندے اور تھوہڑ کے پودے۔ چھوٹے چھوٹے گہرے گہرے غار، ببول کے درخت کی مٹی کی ڈھیریاں، سانپ کے بل، سفیدی سے لپے پتے مزار، کچی قبریں، دور کونے میں شیشم کے نیچے مجاور اور گورکن کے کچے گھر کھڑے تھے۔ گورکن کی بیوی نے رات کے کھانے کے لئے چولھا سلگا دیا تھا۔ اور کہرے کو لپیٹتا ہوا دھواں آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ ایک گوشے میں تین چار ٹوٹے ہوئے گھڑے بکھرے پڑے تھے۔ ایک قبر پر کسی نے چراغ جلا دیا تھا، اور اس کی لو سے کتبے کا طاقچہ سیاہ ہو چکا تھا

سڑک کی رخ والی منڈیر کے نیچے چنبیلی کی خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو چرواہنیں اپنی بکریوں کو ہنکاتی ہوئی ادھر سے گزریں۔ اور چنبیلی کے سائے میں بنی ہوئی ایک نئی قبر کو دیکھ کر ایک چرواہن نے کہا۔ سہاگن کی قبر ہے، جبھی چنبیلی رات کو ایسی مہکت ہے۔ شام کے سناٹے میں سرد ہوا قبر پر جھکی بیری کی ٹہنیوں میں سرسرانے لگی۔

جمشید کو ڈر سا لگا۔ اس نے چپل جھٹک کر تلوے کے نیچے سے ایک کنکری نکالی، اور مٹی کے تودوں اور اینٹوں کو پھلانگتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا، شاید مہاوٹیں برسنے والی تھیں۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے، جمشید بغلوں میں ہاتھ دیے بہت دیر تک سوں سوں کرتا بہت دیر تک منڈیروں پر گھومتا رہا۔ ہاتھی پارجتی پور کی گڑھی کی طرف سے واپس آ رہا تھا، تالاب کے کنارے گولر کے نیچے کھڑے ہو کر جمشید نے بڑی دل چسپی سے ہاتھی کو دیکھا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چھوٹی بٹیا ہودے میں دوارکا پرشاد سے نل دمینتی کا قصہ سننے میں اس قدر محو تھی کہ ان کی سرخ چھتری ان کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر گئی۔ ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

جمشید نے نقرئی موٹھ والی رنگ برنگی ریشمی چھتری زمین سے اٹھائی، اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے مہاوت کو آواز دی مگر ہاتھی بڑھل کے درختوں میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ چھتری ہاتھ میں لیے لیے گھر واپس لوٹ آیا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے چھتری بیٹھک کے ایک کونے میں کھڑی کر دی، اور چکر لگا کر ڈیوڑھی کی طرف پہنچا۔ چپلیں اتار کر ان کی گرد جھاڑی

ان کو دیوار پر رکھا، اور پھر ایک پاؤں تاند پر ٹکا کر اندر آنگن میں کود گیا۔

اس کے تینوں اداس شکلوں والے بزرگ بڑے ابا، چچا ابا اور ابا دالان میں تخت پر حسب معمول سر جھکائے ہوئے تھے۔ چچی دال میں بگھار لگا رہی تھی، چچا ابا کی بڑی لڑکی منظور النسا بلاوجہ اچھلتی کودتی رہی تھی، اور زور زور سے الاپ رہی تھی

ڈنڈا ہرا یا گلی رودت ہے

ڈنڈے کی ماں روٹی پودت ہے

اتنے میں چچی باورچی خانے سے نکلیں، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور زور کا طمانچہ لگایا۔۔۔جب دیکھو تب کھیل۔۔۔اتنی بڑی ہوگئی ہیجب دیکھو تب کد کڑے۔دونوں وخت بلت ہیں۔اپنے ابا کے وضو کا پانی لگا۔۔۔

منظور النساء بھائیں بھائیں کر کے رونے لگی، اور پناہ لینے کے لئے بائیں پھیلا کر اپنے چچا زاد بھائی کی طرف دوڑی، جو اسی وقت دیوار سے اندر کودا تھا۔جمشید نے بے پرواہی سے اپنے چپل دیوار سے اتار کر اسے تھما دیئے۔

جا انہیں کوٹھری میں رکھ آ۔اس نے لڑکی سے کہا۔منظور النساء نے فوراً رونا بند کر دیا، اور گرد آلود بڑے بڑے چپلوں کو بڑے پیار سے اپنی بانہوں میں سنبھالا، گویا وہ اس کی چہیتی گڑیاں تھیں اور اندر چلی گئی۔

جمشید مونڈھا کھینچ کر اپنے بزرگوں کے پاس بیٹھ گیا۔جھینگا پاسی کی عورت سائبان میں سے گائے کھول کر ناند کی طرف لے جا رہی تھی۔باہر گاؤں کے گھروں میں چراغ جل چکے تھے، سید مظہر علی کی بی بی نے دالان میں آ کر روئی کے پردے چھوڑ دیئے تھے، مغرب کی اذان ہوئی۔۔۔اندھیرا چھا گیا۔۔۔

شبرو مشعلچی نے سارے خیموں مین جا جا کر گیس کے ہنڈ لے لیمپ اور لال ٹین جمع کیں، ان کو باورچی خانے کی چھول داری سامنے لا کر ایک قطار میں رکھا، مدار بخش خدمت گار آئے، اور اس قطار کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، اور انہوں نے جھاڑن سے شیڈ اور چمنیاں صاف کرنا شروع کیں۔چھوٹی بٹیا ایک طرف سے اچھلتی کودتی آئی، اور اکڑوں بیٹھ کر بڑی دل چسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگی، ان کو ہر شام یہ تماشا دیکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

مدار بخش نے چمنیاں صاف کر کے بتیاں روشن کرنا شروع کیں، اور ہمیشہ کی

طرح پہلا چراغ روشن کرتے ہوئے انہوں نے زیر لب کہا ''چراغ روشن مراد حاصل صلواۃ صلواۃ سلام الیکم یا منکر نکیر۔۔۔''

دل میرا ایمان قبر میرا مکان۔۔

مدار بخش تمہارا مکان قبر میں کیوں ہے۔چھوٹی بٹیا نے ایک بار پھر بڑی حیرت سے اپنا سوال دہرایا۔

شبیر۔۔۔بلاقن کو بھیجو۔۔۔جنم جلی نے ابھی تلک استری گرم نہیں کی۔۔۔دور کے خیمے سے میم صاحب کی آواز آئی۔چھوٹی بٹیا کو استری کا تماشا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔۔۔

وہ تیر کی طرح بھاگتی ادھر پہنچی۔۔۔ماما، ماما----------بلاقن جلی کیوں ہے۔ ؟انہوں نے دریافت کیا۔

بھاگ جاؤ یہاں سے

نہیں۔۔۔بتایئے نا ماما۔۔۔

ہے ہی وہ جنم جلی۔۔۔میم صاحب نے غصے سے جواب دیا۔دراصل وہ اس وقت دوارکا پرشاد سے مخاطب تھیں۔

ماں باپ کو کھا گئی۔میاں نے دوسری عورت کر لی،گھر کا بارہ باٹ ہو گیا،مگر وہ بختنی بھی کیا کرے۔سب کرموں کا پھل ہے،۔۔

ماما کرموں کا پھل کیا ہوتا ہے،

بیٹا چلیے آپ کو کمشنر صاحب بلاوت ہیں۔دوسرے چپڑاسی نے اندر آ کر کہا۔وہ اسی تیز رفتاری سے خیمے سے باہر نکل گئیں۔کیمپ میں اس رات بڑا بندوبست تھا، چاروں طرف گیس کے ہنڈے جھک جھک کر رہے تھے،چھوٹی بٹیا کو آج خاص طور پر اجازت مل گئی تھی کہ وہ بڑوں کے ساتھ کھانا کھائیں۔وہ خیمہ طعام میں اپنی اونچی کرسی پر بیٹھی ''انکل جانسن کو جمبو کی سواری اور گڑھی پار بتی پور کے پالتو ہرنوں اور

بارہ سنگوں کا قصہ سنا رہی تھی۔عمر کے لحاظ سے چھوٹی بتیا کا قد بہت چھوٹا تھا۔اس لئے وہ اونچی کرسی پر بیٹھ کر ہی میز کے برابر آسکتی تھیں،میز کے سرے پر میم صاحب سورت کے روپہلی ''پارسی بارڈر والی پیازی ریشمی ساڑھی اور وائیٹ ویز کلکتہ کے یہاں خریدا ہوا فر کوٹ پہنے روسٹ کاٹنے میں مشغول تھیں۔سنہری مائل کتھئی بالوں کے گچھے مروجہ فیشن کے مطابق ان کی پیشانی اور کانوں پر چھائے ہوئے تھے۔اور انہوں نے کانوں میں انگریزی وضع کے بندے پہن رکھے تھے۔جس میں طلائی زنجیروں کے سرے پر دو بڑے بڑے موتی لٹک رہے تھے۔جب میم صاحب دوران گفتگو سر ہلاتیں،تو یہ بندے گھڑیال کے پنڈولم کی طرح ہلتے۔میم صاحب انگریز نژاد تھیں۔مگر انگریزی انہیں واجبی ہی آتی تھی،اور شادی سے پہلے اپنے میکے میں ان کی پرورش سخت پردے میں ہوئی تھی،لیکن ان کی سفید رنگت اور ذرا لائیتی چہرے مہرے کی وجہ سے نوکر چاکر انہیں بیگم صاحب کے بجائے اوہدا کے میم صاحب کہنے پر مصر تھے۔

میز کے نیچے انگیٹھی دہک رہی تھی،پرال پر بچھی ہوئی دری پر ملازمین قابیں اٹھائے دبے پاؤں ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔میم صاحب جانسن صاحب کو بسنتی بیگم کے اغوا کا قصہ سنانے لگیں۔جانسن صاحب بہت نفیس اردو بولتے تھے۔

مگر نواب بھورے بھی ایک گھاگ ہیں۔پرانے سیاران کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ہمیں بے چاری بوٹا بیگم پر بڑا ترس معلوم ہوتا ہے ---------- میم صاحب سے کہا

۔

جنوری کی رات کی یخ بستہ ہوا تیز ہوگئی۔خیمے کی دیواریں ہلنے لگیں،سن سن کرتے گیس کی روشنی ذرا مدھم پڑی،تو شبروا نے پھرتی سے اس میں گیس بھر دی۔مدار بخش نے لپک کر آخر کورس کے لئے پلیٹیں بدلیں۔جب انہوں نے ایک قاب جانسن صاحب کے آگے پیش کی۔جانسن صاحب نے نفی میں سر ہلا دیا۔مدار بخش

نے بڑی متانت سے ان سے کہا۔۔

پھنس۔۔۔یعنی فنش۔۔۔یعنی یہ آخری کورس ہے۔مدار بخش پر تکلف دعوتوں کے موقع پر انگریز مہمانوں سے ہمیشہ انگریزی بولتے تھے۔جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ان کے دادا پردادا صاحب لوگ کے بنگلوں پر بولتے آئے تھے۔

جانسن صاحب نے میز بان خاتون سے ڈنر سروس کی تعریف کی، اور میم صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ روسی برتن انہوں نے پشاور سے منگوائے تھے۔جہاں ۱۷ء کے انقلاب سے پہلے کے مشہور روسی برتنوں کی ایک دکان تھی۔اس کے بعد جانسن صاحب نے کلکٹر صاحب سے کل کے شکار کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔خیمے کی ایک دیوار ذرا زور سے ہلی، در درز میں دو متحیر آنکھوں نے اندر جھانکا۔

جمشید نے ایک بار پھر ہمت کی، کہ اندر جا کر چھتری میم صاحب کو دے دی۔ لیکن ایک بار پھر اس الف لیلوی منظر میں کھو گیا۔اب بلوری پیالے میز پر لائے گئے۔جن کے پانی پر سرخ گلاب کی پنکھڑیاں تیر رہی تھیں،مگر ان لوگوں نے یہ پانی پینے کے بجائے پیالوں میں اپنی اپنی انگلیاں ڈبو دیں۔

جمشید نے سنہرے بالوں والی بچی کو دیکھا،جس کے عین مغز کے اوپر سرخ رنگ کا بڑا سا ربن سجا تھا۔اسے اپنی چچا زاد بہن نور النساء یاد آئی، جو کانوں کے بہت سارے سوراخوں میں چاندی کی میلی میلی بالیاں پہنتی تھی، اور موٹی جھوٹی مارکین، ڈوریے اور گاڑھے کے خاک آلود کپڑوں میں بھٹکتی رہتی تھی۔اور بڑی ہو کر اس کے پلے بندھے گی۔اور وہ دونوں کان پور کی ایک تنگ و تاریک گلی میں اسی سفید پوشی اور تنگ دستی کی زندگی گزار دیں گے۔جیسی زندگیاں ان کے باپ، چچا، دادا اور پر دادا نے گزاری تھیں، جب کی میم صاحب اور کلکٹر صاحب اور ان کی برادری والے اسی طرح معطر پانی کے بلوریں پیالوں میں نفاست سے اپنی انگلیاں ڈبوتے رہیں گے۔

دیوار کا پردہ ہلتا دیکھ کر مدار بخش اچانک اس کی طرف متوجہ ہوئے ۔وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا،

اندر جانسن نے سگار سلگایا۔میز بانوں کو شب بخیر کہا، بچی کو پیار کیا اور کھڑ کھڑاتا ہوا چمکیلا سفید نیپکین میز پر رکھ کے کرسی سے اٹھے، دوارکا پرشاد نے باہر سے لپک کر دروازے کا پردہ اٹھایا۔جانسن صاحب بے حد لمبے تڑنگے انگریز تھے۔وہ سر خم کر کے دروازے سے باہر نکلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔ دوارکا پرشاد سرخ بانات کی اچکن پہنے پھر دروازے کے پاس اپنے اسٹول پر آن بیٹھے۔انہوں نے جمشید کے پیروں کی چاپ سن لی، اور آہٹ پر کان لگا دیئے۔

کون ہے۔۔۔انہوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

جمشید صاحب ہڑبڑا کر سرپٹ بھاگا، بھاگنے میں خیموں کے رسوں میں الجھ گیا۔ دوارکا پرشاد اور دوسرے چپڑاسیوں نے اسے پکڑ لیا۔چور چور وہ سب چلائے، اور اس کے ہاتھ سے چھتری چھین لی،

چور۔۔۔سرقہ۔۔۔چوٹے۔۔۔دوارکا پرشاد نے جمشید کے منہ پر زور کا تھپڑ رسید کیا۔

ہم چور نہیں ہیں۔۔۔اس نے بھنا کر کہا، اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔۔۔ہم بٹیا کی چھتری دینے آئے تھے، ہمیں تالاب کنارے پڑی ملی تھی----------سرو۔۔۔۔ہم کا پڑوت ہو بے ایمان۔۔۔دوارکا پرشاد گرجے، اور تین چار طمانچے اور لگا دیئے۔

مدار بخش۔۔۔اندر سے میم صاحب نے آواز دی، مگر مدار بخش بھی موقع وار دات پر پہنچ چکے تھے۔

چھوٹی بٹیا نے بھی دروازے سے جھانکا۔۔۔ماما۔۔۔ماما۔۔۔ماما۔۔۔دوارکا پرشاد نے چور پکڑا ہے۔انہوں نے بے حد خوش ہو کر کہا۔۔

یہ کیا ہلا رہا ہے؟۔۔۔میم صاحب نے دروازے میں آ کر دریافت کیا۔ دفعتاً جمشید نے آنسو خشک کیے،اور میم صاحب کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا،۔۔۔

ہم چور اور بے ایمان نہیں ہیں، ہم سید جمشید علی ہیں۔ہم درگاہ شریف کے شاہ منور علی کے بھتیجے ہیں۔ہمارے چچا سید مظہر علی صبح آپ کو سلام کرنے۔پھر اس نے جلدی سے الفاظ تبدیل کیے۔آپ سے ملنے آئے تھے،مگر آپ نے ان کو باہر ہی سے لوٹا دیا۔

شاہ منور علی۔۔۔میم صاحب نے ذرا دل چسپی سے دہرایا۔۔۔شاہ منور علی۔ ہم نے ان کی شہرت سنی ہے،وہ جناتوں کو قبضے میں کرتے ہیں۔۔۔

بڑے ابا کے قبضے میں کوئی جنات نہیں ہیں، مسلسل افلاس اور احساس محرومی نے ان کے دماغ پر برا اثر ڈالا ہے۔جمشید نے تلخی سے جواب دیا۔سردی کی وجہ سے اس کے دانے بجنے لگے۔اور اس نے ایک سسکی بھری۔

اندر آ جاؤ۔باہر کیوں کھڑے ہو۔

میم صاحب نے کہا۔مدار بخش پلیٹ نکالو،

جی نہیں، میں کھانا گھر سے کھا کر آیا ہوں،

میم صاحب نے اس کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھی۔انہیں اپنا بیٹا سلیمان یاد آ گیا۔ جو اسی طرح غیور اور خوددار تھا۔۔۔

وہ خیمے کے اندر آ کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

بیٹیا۔۔۔جمشید بھیا کا شکریہ ادا کرو،، یہ اتنی سردی میں تمہاری چھتری دینے آئے ہیں،

چھوٹی بٹیا نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں تھینک یو کہا۔۔۔

اب گڈ نائیٹ کہو۔۔۔

،،گڈ نائیٹ۔۔اور اس کے ساتھ ہی وہ بلاقن کے ساتھ باہر چلی گئیں۔

''تمہاری نواب شمس آرا بیگم سے قرابت داری ہے نا؟

میم صاحب نے دریافت کیا۔۔۔

''جی نہیں۔۔۔ چچا ابا ان کی زمین جوتتے ہیں۔ راجاؤں اور نوابوں سے ہماری کوئی قرابت داری نہیں۔۔۔

میم صاحبہ چونکیں۔ لہجے کی یہ تلخی انہیں بت مانوس سی معلوم ہوئی۔ ان کا لاڈلا بیٹا سلمان یونیورسٹی سے گھر آ کر نہ جانے کیا کیا اڑایا کرتا تھا۔ جاگیردار طبقہ۔ برطانوی استحصال، زرعی انقلاب،

نا قابل فہم الفاظ اور اصلاحات۔۔۔

کہیں پڑھتے ہو۔۔۔؟

کانپور میں پڑھتے ہیں سکینڈ ایر میں۔۔

''شاباش''۔۔۔

''اب اجازت دیجئے،

کافی تو پی لو۔۔۔

''کافی۔۔۔؟۔۔۔ کافی اس نے آج تک نہ پی تھی۔۔۔ جی نہیں۔۔۔ اس نے مضبوطی سے جواب دیا۔۔۔

ہمارا گھر گاؤں کے آخری سرے پر ہے۔ پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی ----------اچھا آداب عرض۔۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ خیمے سے نکلا'' اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔۔

گھر پہنچ کر وہ دالان میں داخل ہوا۔ چھوٹے سے دالان میں برابر برابر تینوں بھائی چارپائیوں پر سو رہے تھے۔ چچی اماں اور منظور النساء دوسری طرف تخت پر فرخ آبادی چھاپے کے میلے میلے لحافوں سے منہ ڈھانپے خوابیدہ تھیں۔

وہ آہستی سے جا کر اپنی کھاٹ پر گر گیا۔۔۔ اور پتلا سا لحاف اوپر تک کھینچ لیا،

زیادہ سردی لگی تو الگنی پر ٹنگی ہوئی لوئی بھی لحاف پر ڈال لی، اور ٹانگیں سکیڑ کر کروٹ کے بل گڑی مڑی ہو کر سو گیا۔

تہجد کے وقت شاہ منور علی اٹھے۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے اس کے سر ہانے آئے، کچھ پڑھ کر اس پر دم کیا۔۔ اپنے تکیے کے نیچے سے نکال کر ایک تعویذ اس کے بازو پر باندھا، اور پھر جا کر اپنی چارپائی پر پڑ رہے، اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ مگر وہ دم سادھے لیٹا رہا، اور اس کا جی چاہا کہ خوب روئے۔ کچھ دیر بعد چچی امی اٹھیں، اور انہوں نے لالٹین جلائی۔

منظور النساء بھی فوراً اٹھ بیٹھی۔ دونوں ماں بیٹیاں دولائیاں سر پر اوڑھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ اور وہاں انہوں نے جمشید کے لئے ناشتہ تیار کرنا شروع کیا، وہ پھر اونگھنے لگا، صبح کاذب کے وقت مرغ نے صحن کی دیوار پر اذان دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، اس کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اس نے جلدی سے اندھیری گھپ کوٹھری میں جا کر اپنا ٹین کا بکس نکالا۔ دری میں بستر لپیٹا، اور کور میں جا کر آہستہ سے آواز دی۔ منظور النساء بھاگی بھاگی آئی۔ دالان کی دیوار پر ٹنگی ہوئی تیل کی ڈبیا روشن کی۔ مچان پر سے چپل اتاری۔ اس کا کوٹ لائی۔ کھونٹی پر سے اس کا مفلر اتارا۔ منہ دھونے کے لئے گرم پانی لے کر آئی، اور لوٹا اور بیسن دانی تخت کے کنارے رکھ دی۔۔۔

چچی جان نے ناشتہ دان بھر کر تخت پر رکھا، اور چائے بنانے کے لئے پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

بھیا، تمہارے لئے پوری ہم خود بناوا ہے۔ منظور النساء نے کہا۔۔۔

اچھا۔۔۔ جمشید نے جوتوں کے فیتے باندھتے ہوئے ذرا محبت سے اسے دیکھا اور اس کا دل پسیج گیا۔ بے چاری۔۔۔۔ بے چاری۔۔۔۔ بدنصیب لڑکی۔۔۔ اس نے دل میں کہا۔۔۔

ڈیوڑھی میں آ کر گوبندا نے آواز لگائی ۔اس کے باپ اور چچا جاگ اٹھے، چچی نے اس کے بازو پر امام ضامن باندھا۔وہ گوبندا کے یکے پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا، چنے کے کھیتوں پر کہرہ ڈولتا تھا،اور چاند کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی، بہت دور کلکٹر صاحب کے کیمپ میں اکا دکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں ۔دریا کے پار سے ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دی ۔آم کے باغات، خانقاہ، تالاب، ہنومان جی کا مندر ۔جھینگا پاسی کا جھونپڑا، بڑے ابا، چچا ابا، چچی اماں، منظور النساء۔۔۔ یہ سارے ہیولے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک بڑے دھندلکے میں غائب ہو گئے ۔اس رات کیمپ سے واپس آ کر اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ جی توڑ کر محنت کرے گا۔فرسٹ ڈویژن لائے گا ۔مقابلے کا امتحان پاس کرے گا ۔اور ایک دن اس کے نام کے آگے لکھا جائے گا۔۔ایس جے علی، آئی سی ایس۔۔۔

پھر جب میں محمد گنج آؤں گا تو کسان کہیں گے، جنٹ صاحب دورے پر آئے ہیں، جنٹ صاحب، کلکٹر صاحب، کمشنر صاحب، کچے رستے پر یکے کو زور کا دھچکا لگا۔ ۔۔اس نے جلدی سے یکے کا ڈنڈا پکڑلیا، اور دوسرے ہاتھ سے جیب سے پاسنگ شو کی ڈبی نکالی ۔ جب اس نے ماچس نکالی تو گوبندوا نے اسے مڑ کر دیکھا----------

ای کا کرت ہو، اس نے صدمے سے کہا۔۔۔

گھر پر نہ بتانا گوبند چچا۔۔۔۔جمشید نے بڑی لجاجت سے کہا۔ای، سی، ایس کے سارے خواب گوبندوا کی تیوری پر بل دیکھ کر پل کی پل میں ہوا ہو گئے ۔

اچھا نہ کہیا،، ہل سہرن مارہ کے اس سب نہ سیکھو۔۔۔

گوبندوا نے مریل گھوڑے کو دوبارہ چابک لگائی ۔۔۔چلت نہیں سسر،، تو ہوگا ہرگٹ چاہی۔۔۔؟

جمشید نے ایک طویل سانس لے کر ناک سے دھواں نکالا----------اتنے

میں سامنے سے گوبر دھن چچا آتے دکھائی دیئے، وہ کندھے پر ہل رکھے بیلوں کی جوڑی ہنکاتے اپنے کھیت کی طرف چلے جا رہے تھے، جمشید نے گھبرا کر سگرٹ مٹھی میں چھپالیا۔

گوبر چچا نے اگر دیکھ لیا تو یکے سے اتار کر پچاس جوتے لگائیں گے، اور گنیں گے ایک نہیں،۔

گاؤں میں کس قدر دقیانوسیت ہے۔ اس نے شدت کی جھنجلاہٹ کے ساتھ سوچا، ہندوستان کے گاؤں۔۔۔ ہاہاہا۔۔ ہندوستان کے گاؤں ----------

اسے معلوم نہ تھا کہ اس صبح وہ تقریباً آخری بار اپنے گاؤں سے جا رہا تھا، اور اس کے بعد وہ کبھی اس طرح محمد گنج نہ آئے گا۔ اس طرح گوبندوا کے یکے پر نہ بیٹھے گا۔ گوبر دھن چچا سے خائف ہونے کی ضرورت اسے کبھی محسوس نہ ہوگی۔

۲

کان پور پہنچ کر وہ اپنے گھر کی سیڑھیوں پر چڑھا، سامنے گلی کی دیوار پر بھابھی اور پکار فلموں کے اشتہار اور کانگرس کے جلسے کے پوسٹر لگے تھے، بیٹھک کے دروازے پر چق پڑی تھی، اندر اینٹوں کے فرش پر ایک میز اور موکلوں کے لئے تین چار کرسیاں رکھی تھیں، کونے میں قانون کی موٹی موٹی گرد آلود کتابیں الماری کے تختوں پر چنی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر سید اختر علی کی تصویر لگی ہوئی تھی، جس میں وہ بی، اے، ایل ایل، بی کا گاؤن پہنے کمرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ باقی دیواروں پر سر سید احمد خاں، اور تاج محل کی تصاویر آویزاں تھی، پنجتن پاک کے نام اور کلمے اور فاعتبروا یا اُولی الابصار'' فریموں میں لگے تھے، اور مدینہ منورہ کا ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ ایک کونے میں تذکرہ غوثیہ کی جلد و نظام المشائخ، دین و دنیا اور مدینہ کے فائل دھرے تھے۔۔۔۔ سلطان الہند اور خواجہ غریب نوازؒ کی درگاہ کی ایک بڑی سی تصویر کارنس پر رکھی تھی، کئی برس قبل سید اختر علی نے اپنے حصے کی زمین

بیچ کر کان پور میں یہ مکان خریدا تھا، اور پریکٹس شروع کی تھی، جمشید میلا سا سوتی پردہ اٹھا کر زنان خانے میں گیا، اندر پتلے اور لمبے کمرے کے چاروں دروازے دالان میں کھلتے تھے، کمرے میں اس کے تینوں بہن بھائیوں کی چارپائیاں بچھی تھیں، اس کی اپنی چارپائی کے سرہانے اس کی میز لگی تھی۔ جس پر اس کی کتابوں کا انبار تھا، جن پر اخبار اور باتصویر رسالوں کے کاغذ کے کور چڑھے ہوئے تھے، اور کڑھے ہوئے میلے میز پوش پر سیاہی کا بڑا سا دھبا لگ گیا تھا۔ ایک کونے میں اس کی سائیکل کھڑی تھی، اس کی اماں سل میں مبتلا دالان میں لیٹی تھی، چھوٹی بہن عالیہ باورچی خانے میں تھی۔

جمشید نے اسباب ایک چارپائی پر رکھا، اور دالان کے تخت پر بیٹھ کر جوتوں کے فیتے کھولنے لگا،

بھیا گاؤں سے روپیہ لائے؟۔۔۔ عالیہ کی آواز پر وہ چونکا، روپے،،؟

ابا نے کہا تھا کہ چچا ابا سے لے کر روپیہ بھیجیں گے۔ ان کو گئے اتنے دن ہو گئے ہیں، چھٹیوں میں تم بھی چلے گئے، یہاں سب پڑوسیوں کا قرضہ چڑھ گیا ہے۔

نہیں۔۔۔ ہم روپے نہیں لائے، مگر ابا کو جلد نوکری مل جائے گی شاید، ورنہ ہم کالج چھوڑ کر خود نوکری کر لیں گے، ارے ارے، روتی کیوں ہے گدھیا؟

اس نے عالیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا، اماں نے جو برسوں سے پلنگ پر پڑے پڑے بے حد چڑچڑی ہو گئی تھیں، حسب معمول چیخنا چلانا اور کھانسنا شروع کر دیا، جمشید تخت کے کنارے چپ چاپ بیٹھا رہا----------

آلہ آباد سول لائنز کی ایک پرانی طرز کی کوٹھی کی برساتی میں ایک لمبی چوڑی ۳۵ء ماڈل کی سیون کار تیزی سے آن کر رکی، اور ایک حساس شکل اور سانولی رنگت والا نوجوان بے حد اکسائیٹیڈ انداز میں کار سے اتر کر اپنے کمرے میں گیا، جلدی جلدی میز کی درازیں کھولیں۔ کاغذات الٹ پلٹ کر ایک پرس تلاش کیا، سرخ رنگ

کا ایک چھوٹا سا دو ہزار کارڈ جیب میں سے نکالا۔ ایک دفعہ اس کے اندر لکھا ہوا اپنا نام پڑھا، اور بڑی احتیاط سے اسے پرس میں رکھ دیا۔۔۔

ملازم ڈاک لے کر آیا، ماما کی لکھائی لفافے پر دیکھ کر وہ محبت سے مسکرایا، اور خط پڑھنا شروع کیا---------- ہم دورہ ختم ہوتے ہی سیدھے آلہ آباد آ رہے ہیں، اب تمہیں آئی، سی، ایس امتحان کی تیاری کرنا ہے، ہماری عدم موجودگی میں نیازی بیگم تمہارے کھانے پینے کا بالکل خیال نہیں رکھتیں، اب تم ماشا اللہ سے ----------خط ختم کر کے اس نے واپس لفافے میں رکھ دیا، اور اداسی سے مسکرایا، پھر وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہوا، اور سگرٹ جلا کر سوچنے لگا---------- ہم بابا اور ماما کو یہ اطلاع کن الفاظ میں دیں، کہ ہم ان کی ساری درخشاں امیدوں پر پانی پھیرنے والے ہیں----------

محمد گنج کی خانقاہ کی منڈیر پر بیٹھ کر سید مظہر علی نے خط شکست میں پوسٹ کارڈ لکھنا شروع کیا----------

برخوردار سعادت آثار، راحت جاں عزیزی جمشید میاں طول العمرہ، واضح ہو کہ تمہارے ابا چن دو در چند وجوہات کی بنا پر ہنوز محمد گنج میں ہیں، کیمپ اٹھ چکا ہے، تمہارے ابا نے متعدد درخواستیں لکھ کر سکتر صاحب کے دفتر بمقام لکھنو روانہ کر دی ہیں، اللہ بہتری کرے گا، دیگر احوال یہ ہے کہ بوٹا بیگم کے مقدمے کی پیشی ملتوی ہو گئی ہے، کلکٹر صاحب نے بہ کمال مہربانی ان کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا ہے،

اور دوران مقدمہ بوٹا بیگم مع اپنی لڑکی کے شہر آلہ آباد میں کلکٹر صاحب کی سرپرستی میں رہیں گی، نواب شمس آرا بیگم نے حرفہائے خلاف و نامعقول اس ضمن میں سب سے کہے ہیں،

نیز تمہارے ابا کہتے ہیں کہ اپنی سائیکل فروخت کر دے،۔

چھ مہینے بعد جمشید کو ایک اور پوسٹ کارڈ ملا۔۔۔

برخوردار نورچشم سلمہ تعالیٰ یہ معلوم کر کے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ تم نے ٹیوشن شروع کر دی ہے ۔ تمہارے ابا کے روز گار کی ہنوز کوئی صورت نہیں نکلی ----------اب وہ دن بھر خانقاہ میں بیٹھے رہتے ہیں، ہم کو فکر شدید اس امر کی ہے کہ خدانخواستہ ان کا خطرہ نہ ٹل جاوے، کیوں کہ کل وہ ہم سب سے کہتے تھے کہ ان کو بشارتیں ہو رہی ہیں، بھائی صاحب قبلہ ک وبھی ان کی طرف سے ازحد تشویش لاحق ہے، اللہ سے دعا کرتے رہو، وہ مسبب الاسباب ہے۔

دو سال بعد پوسٹ کارڈ آیا۔۔۔

نورچشمی منظور النساء سلمہا اب اس لائق ہو چکی ہے کہ اس کو اس کے گھر بھیج دیا جاوے ۔لہذا عید کے چاند اسے رخصت کر کے لے جاؤ ۔تمہارے ابا اب مستقل ندی کے کنارے کٹی میں رہتے ہیں ----------

دو روپے گز والے سرخ کاٹن کے غرارے اور ریشمی ململ کے سرخ دوپٹے قمیض میں ملبوس ، گلے میں چاندی کا طوق، ملکہ وکٹوریہ کے روپوں والی ہمیل ،اور کانوں میں چاندی کے بالی پتے پہنے، لانبی چوٹی میں گوٹے کا موباف ڈالے، لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے، منظور النساء دلہن بنی برقعے میں لپٹی تانگے سے اتری۔اس کے جوڑے پر جھوٹا لچکا تھا، اس نے ہاتھوں میں فیروز آباد کی سرخ ریشمی چوڑیاں اور چاندی کی پہنچیاں پہن رکھی تھیں، انگلیوں میں چاندی کے چھلے تھے، ہتھیلوں میں تیز سرخ مہندی رچی تھی ، بازوں پر چاندی کے جوشن بندھے تھے، سرخ ریشمی موزوں اور انگریزی گرگابی والے پاؤں میں چھڑے اور رچھا گل چھن چھن کر رہے تھے، تین موتیوں والی بڑی سی نتھ اس کا واحد طلائی زیور تھا، یہ سارے گہنے اس کی ماں کے جہیز کے تھے، صرف اس کے سات جوڑے ، دولہا کا ریشمی اچکن کا جوڑا، اور تانبے کے چار برتن اور مراد آبادی پان دان سید مظہر علی اشرفی لال مہاجن سے ادھار لے کر بنوا سکے تھے، تانبے کے باقی سات برتنوں پر جوان کی بیوی نے منظور

النساء کی پیدائش کے وقت سے سینت سینت کر پچھلی کوٹھری میں چن رکھے تھے، دوبارہ قلعی کروادی گئی تھی،

نیم تلے شادی کا کھانا ہوا تھا، آلو گوشت کا شوربہ، تنوری روٹیاں اور زردہ مٹی کے کونڈوں، رکابیوں اور سکوریوں میں نکال کر مہمانوں کے سامنے رکھا گیا تھا،

تام چینی کی پھول دار رکابیاں صرف دولہا اور مولوی صاحب اور چند اور خاص خاص مہمانوں کے لئے تھیں، ہندو احباب کے لئے کچھ فاصلے پر پنڈت لچھمی نرائن نے برگد تلے اپنی نگرانی میں بھوجن بنوایا تھا، جو کیلے کے پتوں پر پروسا گیا تھا، شہنائی بج تھی، مہمانوں کو محظوظ کرنے کے فرائض چپاتی بھانڈ کے سپرد تھے، شادی کے خرچے میں سید مظہر علی کا بال بال قرضے میں بندھ گیا تھا۔ منظور النساء ان کی اکلوتی اولاد تھی، اور وہ اس کی صورت دیکھ کر جیتے تھے، ان کی جی چاہتا تھا کہ اشرفی لال کے دوس درسو دکی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی لاڈلی بچی کے بیاہ میں دل کے سارے ارمان نکالیں۔ مگر قدم قدم پر ان کے افلاس کا بھوت سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اور وہ جی مسوس کر رہ جاتے، جب رخصتی کا وقت قریب آیا تھا، تو وہ گھر سے چلے گئے تھے اور درگاہ کی منڈیر پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گئے تھے، بیٹی کی سرخ پالکی نیم تلے رکھی گئی، تو اسے وداع کرتے ہوئے انہوں نے جمشید سے کہا تھا۔۔۔

بھیا یہ بڑی بے زبان اور غریب بچی ہے، تمہاری کنیز بن کر رہے گی۔ اس کا دل کبھی نہ دکھانا۔

سرخ رنگ کی سوتی چادر اوڑھے جس پر ابرق کے بڑے بڑے پھول چھپے تھے، منظور النساء پالکی میں سر جھکائے بیٹھی تھی، پھر اس کی پالکی اسٹیشن روانہ ہوگئی تھی، جھینگا پاسی اور اس کے لڑکوں نے جہیز کے ٹرنک اپنے سروں پر اٹھا رکھے تھے، اور سب سے آگے جامہ پہنے، سہرا باندھے، سرخ رومال ہاتھ میں لئے، جمشید دولہا بنا گوبندوا کے یکے پر بیٹھا تھا،

تانگے سے اتر کر منظور النساء اپنے گھر میں داخل ہوئی ،شہر کی پروردہ عالیہ نے اسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا، اور ذرا منہ بنا کر آواز دی،،

اماں دلہن بھابھی آ گئیں ۔۔۔

منظور النساء کو دالان کے برابر والی کوٹھری میں بٹھا دیا گیا، جو اس کا حجلہ عروسی تھا، یہاں محلے والیوں کے سامنے اس کی منہ دکھائی ہوئی ، جو ایک ایک روپیہ دو دو روپے اس کے سامنے بچھے ہوئے سرخ رومال میں ڈالتی گئیں ،ایک ہفتے تک وہ دن بھر بغیر ہلے جلے پلنگ پر سرنگوں بیٹھی رہی ،اور جب کوئی محلے والی اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ دستور کے مطابق فوراً آنکھیں بند کر لیتی،

اس کے بعد منظور النساء نے آنکھیں کھولیں ،اور اپنے گھر کو دیکھا ، یہ چھوٹا سا مکان اس کے لئے محل کے برابر تھا ،اس میں برقی روشنی تھی ،میز کرسیاں تھیں ۔چینی کے برتن تھے ۔کاغذی پھولوں سے سجے ہوئے نیلی کانچ کے گل دان طاقچوں میں رکھے تھے، اور اس کی بجلی بسنت نند عالیہ انگریزی سکول میں پڑھتی تھی ۔۔۔

جمشید اب ایم ،اے ،فائنل میں تھا ،اور رات گئے تک ٹیوشن کر کے گھر کا خرچ چلاتا تھا ۔اس نے بیٹھک کا کمرہ بھی کرائے پر اٹھا دیا تھا ،اور کفایت کے خیال سے سگرٹ پینے بھی چھوڑ دیئے تھے ۔بائیس تئیس سال کی عمر میں وہ تلخ مزاج ،قنوطی اور ذہنی وجذباتی طور پر بوڑھا ہو چکا تھا ۔

منظور النساء نے گھر کا سارا کام مشین کی طرح سنبھال لیا تھا ۔۔وہ دونوں وقت کا کھانا پکاتی ، بڑی لگن سے ساس کی تیمارداری کرتی ،ان کی جھڑکیاں اور طعنے سنتی ، دیوروں کی خاطر کرتی ،اور عالیہ سے مرعوب رہتی ۔جمشید اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا ۔مگر اسے اس کا بھی کوئی غم نہ تھا ،اس کا فرض اپنے شوہر کی خدمت کرنا تھا ،اور وہ اپنے شوہر کی پرستش کرتی تھی ۔

لیکن جب وہ پہلوٹھی کے بچے کی پیدائش کے لئے محمد گنج گئی ،تو اس کے بعد

جمشید نے اسے کان پور واپس نہ بلایا۔ اس نے سید مظہر علی کے تشویش ناک اور بعد میں الم ناک خطوں کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا،

جنگ شروع ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ وہ ملٹری اسٹورز کے محکمہ میں حوالدار ہو گیا تھا، سال بھر میں اسے ترقی مل گئی۔ اور وہ شہر کا مکان کرائے پر اٹھا کر گھر والوں سمیت چھاؤنی کے ایک کشادہ اور ہوادار کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ اب وہ چار سو روپے ماہوار پاتا تھا، اور گھر میں کینٹین کے سامان کی ریل پیل تھی، آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے وہ ایمرجنسی کمشن میں درخواست نہ دے سکتا تھا۔ جس کا اسے بے حد افسوس تھا۔ اسی زمانے میں اس نے سگرٹ کا پورا ڈبہ رات بھر میں پھونک ڈالنے کے بعد منظور النساء کو طلاق بھیج دی۔

جب منظور النساء کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی تو سید اختر علی کو کئی سے پکڑ کر منگوایا گیا تھا، اور انہوں نے پوتی کے کان میں اذان دی تھی۔ شاہ منور علی نے ان گنت دعائیں پڑھ کر بچی پر پھونکی تھیں۔ محلے کی عورتوں نے چاول کے کھم بنا کر اور گلگلے تل کر خدائی رات منائی تھی،

نیم تلے چپاتی بھانڈ نے نقلیں دکھائی تھیں۔ اور گاؤں کی البیلی پاتر حشمت ٹھگی لگا لگا کر۔۔۔ کھسلے ڈیل۔۔۔ کھسکے ڈیل۔۔۔ الاپتی سید مظہر علی کے نزدیک پہنچی تھی، جو احباب کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، اور نواسی کی پیدائش کی خوشی میں انہوں نے بڑے رومال کی گرہ سے دو روپے نکال کر اسے دیئے تھے۔ اندر صحن میں جھینگا پاسی کی عورت گھونگھٹ کاڑھ کے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر ناچی تھی۔ حیدری ڈومنی اور اس کی بہنوں نے جچہ گیریاں گائی تھیں۔ اور چوں کی منظور النساء بچی کی پیدائش میں مرتے مرتے بچی تھی، اس لئے چند روز بعد شکرانے کے طور پر بی بی کی صحنک بھی کی گئی تھی۔

جب بچی کا عقیقہ ہوا، تو نانا نے اس کا نام فرحت النساء بیگم رکھا، شاہ منور علی

نے اسے گنڈے تعویذوں سے لاد دیا تھا۔صحن میں ڈھولک رکھی گئی تھی ۔اور منظور النساء ''آنکھ کے نشے'' کا فالسی جوڑا پہنے بچی کو گود میں لیے چارپائی پر بیٹھی سہیلیوں کو حسب معمول کان پور شہر کے حیرت ناک قصے سناتی رہی ۔سڑکوں پر ٹن ٹن کرتی ریلیں چلت ہیں ۔ یہ بڑے بڑے کارخانے ۔رات کو آنگن میں سوؤ۔صبح کو دھواں دھار اٹھو۔ایک دفعے ہم ان کے ساتھ سینما بھی گئے رہے۔

اسی وقت سمبھو دادا جو گاؤں کے ڈاکیئے بھی تھے ۔رجسٹری خط لے کر آئے ۔ ۔

۔

سید مظہر علی کی بی بی گم سم بیٹھی پالنے کی ڈوری ہلایا کیں ۔ ۔ ۔گاؤں بھر کی عورتیں گھر میں جمع ہو گئیں ۔نوزائیدہ بچی جس کے ماتھے پر نظر کا ٹیکہ لگا تھا، اور کلائی میں سیاہ ڈوری بندھی تھی ۔اسی طرح ہنس ہنس کر گلکاریاں مارتی رہی ۔باہر نیم تلے توقیر میاں، گوبر چاچا، لالہ مجلس رائے، شیخ رمضان، مولوی محمد حسن، پنڈت چھپی نرائن، گو سائیں کا کا اور گو بندوا سر جھکا کر بیٹھ گئے ۔شاہ منور علی خانقاہ کے اندر کاموش بیٹھے رہے ۔انہوں نے صرف ایک نعرہ لگایا ۔ ۔

بڑی لمبی جائداد اس نے عطا کی ہے ---------شکر ہے ۔ ۔ ۔شکر ہے ۔ ۔ ۔ شکر ہے ۔ ۔ ۔

سید اختر علی گومتی کے ساحل پر مراقبے میں مصروف رہے ۔ان کو کسی نے یہ اطلاع نہیں دی۔

کئی برس گزر گئے ۔بچی کو اس کی نانی پال رہی تھی ۔منظور النساء پکا نے رنڈ ھنے کے بعد زیادہ تو کھیرنی کے درخت کے نیچے پڑے پر بیٹھ کر مناجاتیں پڑھتی ۔ ۔ ۔

توتی سروری اور توتی اکبری

میری بار دیر کیوں اتنی کری

کبھی وہ میلا اکبر کھول کر بیٹھ جاتی۔اور چپکے چپکے ہونٹ ہلاتی۔

جب باغ جہاں کے مالی نے کی دیکھا بھالی پھولوں کی
اک پھول اس میں سے چھانٹ لیا تھی جتنی ڈالی پھولوں کی

گرمیوں کی طویل دوپہر کے سناٹے میں، جاڑوں کی رات کے سرد اندھیرے میں، برسات کی بھیگی دوپہروں میں اس کی آواز اس چھوٹے سے مکان میں گونجا کرتی۔۔۔

تری ذات پاک ہے اے خدا تری شان جل جلالہ
ترا نام عادل کبریا ، تری شان جل جلالہ ،
جسے چاہا جیسا بنا دیا ، تری شان جل جلالہ ،

اکثر وہ روٹیاں بیلتے بیلتے ،فرحت النساء کی چٹیا کرتے کرتے ، دھان دھان بھٹکتے بھٹکتے ،وہ شعر گنگناتی جو اس نے مولوی محمد حسین کی بیوی سے سنا تھا،

دو پھول ساتھ ساتھ پھولے قسمت جدا جدا ہے
اک قبر پہ چڑھا ہے اک سہرے میں گندھا ہے

اس کے دل میں برچھی سی اتر جاتی ،اور وہ سوچتی ،ان کے سہرے میں اب کون سا پھول گندھے گا۔روز وہ اس انتظار میں رہتی کہ اب شہر سے اطلاع آئے گی کہ جمشید نے کسی بی، اے پاس لڑکی سے شادی کر لی ،مگر دن گزرتے گئے اور کچھ نہ ہوا، تب وہ یہ آس لگاتی کہ شاید جمشید اس سے رجوع کر لے ،بیس برس کی عمر میں وہ چالیس سالہ دکھی عورت معلوم ہوتی تھی۔

سلمان مرزا کو بمبئی گئے عرصہ ہو چکا تھا۔کبھی کبھار وہ آلہ آباد آتا اور پھر چند روز

گہوارے اور ذوالجناح کے سامنے کھڑے ہو کر بلک بلک کر دعائیں مانگتیں ۔۔۔یا مولا ، یا مشکل کشا ----------یا سید الشہدا ----------یا امام مظلوم ----------بسنتی کا نصیبہ کھول دیجیئے ۔

بسنتی کو عزت آبرو کے ساتھ ٹھکانے لگا دیجیئے ۔

اس وقت سو روپے کا نوٹ بسنتی نے ان کو لا کر دیا تو ان کو پھریری چڑھی ۔ یہ کثیر رقم ان کی دکھیاری بیٹی کی صلاحیت اور محنت کا صلہ تھا۔

یا الٰہی اس کا مقدر اچھا کر۔۔

آنند موہن گھوش کی ہیڈ مسٹرس کا چھوٹا بھائی تھا۔۔

نمائش میں بسنتی بیگم کی تصاویر دیکھنے کے بعد اس نے ایل ، ایم ، سین کو لکھا ، ۔۔ ۔اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے ایک جینئس کو ڈس کور کیا تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔

اگلی مرتبہ لکھنؤ آرٹ سکول کے پرنسپل ایل ، ایم ، سین جب آلہ آباد آئے تو مس ریبا گھوش نے اپنی ہونہار طالب علم کو ان سے ملوایا۔

آئندہ سال میٹرک کے بعد بسنتی بیگم سرکاری وظیفے پر آرٹ سکول میں داخل ہو گئیں ۔ابھی وہ تھرڈ ایر میں تھیں کہ بوٹا بیگم سخت بیمار پڑیں ۔اور اس نے اپنے آپ کو بسنتی بیگم کہلوانا ترک کیا ، کیوں کہ یہ نام اس کے شدید دکھی بچپن کی یادگار تھا ، الیف ، اے کے بعد وہ اپنے پرانے سکول میں ڈارننگ ٹیچر ہو گئی ۔اس نے بوٹا بیگم سے کہا ۔۔

میں تیرہ برس کی عمر سے دھکے کھا رہی ہوں ۔ سات سال سے ہم لوگ اس محل میں رہ رہے ہیں ، مجھے مفت کے ٹکڑے توڑتے اب شرم آتی ہے ، مجھے سوا سو روپے ماہوار کی نوکری مل گئی ہے ، شام کے وقت میں ٹیوشن بھی کروں گی ، اور شہر میں مکان لے کر رہوں گی ۔اب آپ سامان باندھ لیجئے ۔

اکیلی بٹیا کیسے رہیو؟۔بوٹا بیگم نے بھونچکی ہوکر کہا۔اس نے اکتا کر بحث قطعی طور پر ختم کرتے ہوئے کہا۔ میں وہ بسنتی بیگم نہیں ہوں، جسے نواب بھورے کے سپاہی اٹھا کر لے گئے تھے، اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اکیلی نہیں ہوں، ملک کے سارے عوام سارا محنت کش طبقہ میرے ساتھ ہے۔اس نے آنند موہن گھوش کے الفاظ دہرائے، جس نے اس سے بے حد جوشیلے انداز میں کہا تھا۔۔۔

سوریہ۔۔۔دیش کی ساری جنتا، ساری ورکنگ کلاس تمہارے ساتھ ہے۔

بوٹا بیگم کے پلے کچھ نہ پڑا، کہ یہ نئی حیرت انگیز بسنتی کیا کہہ رہی ہے، انہوں نے جا کر میم صاحب سے کہا۔۔۔

میں سمجھتی ہوں، میم صاحب نے آہستہ سے جواب دیا----------میرا بیٹا اسی طرح گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر گلیوں کی خاک چھاننے نکل گیا۔یہ آج کل کی اولاد ہے ان کو سمجھانا لا حاصل ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی من مانی کریں گے۔جمعرات کی جمعرات تو آتی رہیئے گا نا؟۔میں موٹر بھیج دیا کروں گی، بوٹا بیگم رونے لگیں،

سلمان ایک روز آلہ آباد آیا تو آنند موہن گھوش نے اس سے ثریا حسین کا تذکرہ کیا۔جو صحیح معنوں میں عوامی فن کار بن سکتی تھی، کیوں کہ وہ خود ایک کسان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔شام کو آنند موہن گھوش سلمان کو پرانے کڑے کر ایک چھوٹے سے مکان میں لے گیا، اور دروازے پر دستک دی۔بوٹا بیگم نے اندر سے جھانکا۔

مس حسین ہیں۔۔۔آنند گھوش نے پوچھا،،

کون۔۔۔؟

بوٹا بیگم کی سمجھ میں نہ آیا----------بسنتی۔۔۔انہوں نے دروازے پر آواز دی۔۔۔

ارے بسنتی بیگم۔۔۔سلیمان نے حیرت اور مسرت سے کہا، تم اتنی پر اسرار بن گئیں! میں یہاں مس حسین کے رعب میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا ہوں۔

ثریا نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔۔۔

آیئے آیئے اندر آجایئے۔ بوٹا بیگم سر پر دوپٹہ رکھ کر اندر دبک گئیں۔ ثریا دونوں لڑکوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئیں، جو اس کا اسٹوڈیو بھی تھا۔

سلمان نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔۔۔حد ہے،، کمال ہو گیا----------

اس نے قصر سلمان میں ثریا کو آتو جی کی لڑکی بسنتی کی حیثیت سے دیکھا تھا، جو اس سے کانا پردہ کرتی تھی۔اور عموماً ادھر ادھر دبکی رہتی تھی۔

اس وقت وہ ہونہار آرٹسٹ ثریا حسین کے نگار خانے میں کھڑا تھا۔اس وقت اس نے پہلی مرتبہ ثریا کو غور اور توجہ سے دیکھا، اور اسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی۔

سلمان اب پھر آلہ آباد بھیج دیا گیا تھا۔وہ ثریا کو اپنے ساتھ جلسوں تقریروں اور سیاسی و ادبی محفلوں میں لے جانے لگا۔اور وہ اس کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گئی۔

ثریا اس طبقے سے آئی تھی، جو ان نوجوانوں کے لئے مشعل راہ تھا۔وہ کود اس بھیانک طریقے سے فیوڈل نظام کا شکار ہو چکی تھی۔وہ سب اس سے درگاہ کنڈ کی گڑھی کے واقعات سنتے، جہاں اسے چھ مہینے تک قید رکھا تھا۔

وہ اس قیامت کی رات کا ذکر کرتی، جب ڈھاٹا باندھے ہوئے بدمعاشوں نے اس کے اکلوتے بھائی کو گنڈاسوں سے ہلاک کیا تھا۔وہ اپنے اندھے اور عسرت زدہ باپ کو یاد کرتی۔ جو ایسی درد بھری آواز میں مرثیے اور سوز پڑھتے تھے۔ کہ سننے والوں کا کلیجہ دہل جاتا تھا۔

وہ ساتھیوں کے لئے ہیروئن اور سلمان کے لئے اس کا آورش بن گئی تھی۔اسی زمانے میں اس نے پرائیویٹ طور پر بی، اے بھی کر لیا تھا۔

چھوٹی بٹیا اب کراسویٹ کالج میں پڑھتی تھی۔بوٹا بیگم ہر جمعرات کو قصر سلمان

میں جا کر مجلسیں پڑھتی تھی۔ مگر ثریا ان کے ساتھ بہت کم جاتی تھی۔ اس کی اور سلمان کی دوستی کا خیال کر کے بوٹا بیگم کا دل ہلا کرتا تھا۔

صاحب میم صاحب مجھے کتنا نمک حرام سمجھیں گے، وہ لرز لرز کر سوچتیں۔۔۔ ثریا سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مگر قصر سلمان وہ جھینپی جھینپی آتیں۔۔ میم صاحب نے کبھی اس سلسلے میں ان سے کوئی ذکر نہ چھیڑا۔۔۔

۴۷ء کے اپریل میں چھوٹی بٹیا نے ایف، اے کا امتحان دیا۔ اور اسی مہینے والدین کے ہمراہ مسوری چلی گئیں۔

سلمان آلہ آباد ہی میں تھا جب تقسیم ہند کا اعلان کیا گیا۔

جنگ کے بعد وہ محکمہ ٹوٹ گیا جس میں جمشید ملازم تھا۔ وہ عمر بڑھ جانے کی وجہ سے آئی سی، ایس، اور پی، سی ایس کے امتحانوں میں نہ بیٹھ سکتا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد وہ قسمت آزمانے کراچی روانہ ہو گیا۔۔۔

دن بھر جھڑی لگی رہتی تھی، برساتی کا کالر اونچا کیے تیز تیز قدم رکھتا سلمان مرزا ثریا کے گھر پہنچا۔ شام ہو چکی تھی، گلی میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ پڑوس میں ریڈیو بج رہا تھا۔ اور پنجاب اور دہلی سے نکلنے والے شرنارتھیوں کے پتے ان کے عزیزوں کو سناتے جا رہے تھے۔

فضا پر عجیب سے نحوست اور ویرانی طاری تھی۔ سلمان کے قدموں کی آہٹ پر ثریا نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ وہ اندر آ گیا۔ ثریا نے اس کے لئے کرسی کھڑکی کے نزدیک کھینچ دی۔

ایک دم حبس ہو گیا ہے۔ اس نے خالی خالی آواز میں کہا۔

سلمان نے کرسی پر ٹک کر گھڑی پر نظر ڈالی، اور سگرٹ جلایا۔۔

وقت بہت کم ہے۔۔۔ اس نے متوازن آواز میں کہا، اور ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے قدم کسی کرائسس میں کبھی نہ لڑکھڑائیں گے۔ تم ہمیشہ ہمارا ساتھ دو گی۔

کچھ دیر میں مکمل سکوت طاری رہا۔سلمان اسی طرح ساکت وصامت بیٹھا تھا۔ ثریا نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔اسے اپنے کمینے پن پر پشیمانی ہوئی۔وہ جلدی سے اس کے لئے چائے بنا کر لے آئی۔

ماما کا خط چند روز ہوئے آیا تھا۔سلمان نے چائے میں شکر گھولتے ہوئے جلدی سے کہا۔جس دن ان کی مسوری کی کوٹھی جلائی گئی۔اس کے اگلے روز انہوں نے لکھا تھا۔وہ چھوٹی بٹیا کی وجہ سے بے حد پریشان تھیں۔اب تک سیکڑوں لڑکیوں کو اغوا کیا جا چکا ہے۔

گھبراؤ مت۔ثریا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔وہ لوگ خیریت سے پہنچ جائیں۔

کمرے کی بجلی فیل ہوگئی۔

ہمیں ایک سگرٹ جلا دو۔۔

ثریا نے فرش پر ٹٹول کر سگرٹ اور ماچس تلاش کی،اور اس کے ہاتھ میں دے دی۔سلمان نے سگرٹ جلایا۔ثریا چپ چاپ مونڈھے پر بیٹھی رہی۔کچھ دیر بعد سلمان نے آہستہ آہستہ کہا۔

بابا بہار کے ایک قحط زدہ گاؤں میں فقر وفاقہ سے مانوس

گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔وہ پی سی،ایس میں نام زد ہوئے،اور بافتدار متوسط طبقے میں شامل ہو گئے،مگر ذہنی لحاظ سے وہ ہمیشہ فقیر رہے۔مجھے ماما اور چھوٹی بٹیا کی فکر ہے۔انہیں بڑے شدید جذباتی صدموں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تمھاری مسوری والی کوٹھی جلا دی گئی----------ثریا نے پوچھا۔

ہاں اندھیرے میں سلمان کی آواز سنائی دی،جس نظام نے اس مذہبی عصبیت کو جنم دیا،اسی عصبیت کے ہاتھوں سماج کے محل جلا دیئے گئے۔مگر ثریا محض اسی وجہ سے آج ان بنیادی تضادوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے۔ماضی کی محل سرائیں جل

کر راکھ ہوئیں، مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہونگے۔کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ حاصل کرے گا،

ہماری اصل جدوجہد کا آغاز آج ہو رہا ہے۔۔۔

اس نے ماچس جلا کر گھڑی دیکھی، اور دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ثریا مجھے سرحد پار بھیجا جا رہا ہے،،میرا ساتھ دو گی----------وہ خاموش رہی۔

میرے ساتھ تمہیں زندگی بھر تکلیفیں اٹھانا پڑیں گی۔اور خدا جانتا ہے،تم زندگی میں تھوڑے سے آرام،تھوڑی سی آسائش کی مستحق ہو۔مگر میرے ساتھ تمہیں دل کا چین اور ذہنی سکون ملے گا۔اور میری اتھاہ محبت ملے گی۔

تم وہاں جا کر جانے کہاں کہاں مارے پھرو گے، میں کہاں رہوں گی،

تم سپاہی آدمی ہو،ثریا جنگ جاری ہے،صرف محاذ بدل جائیں گے۔

وہ خاموش رہی۔

ثریا----------۔

وہ خاموش رہی۔۔۔

وہ دیوار سے ٹک گیا۔

ثریا۔۔۔اس نے آخری بار کہا۔۔۔۔

وہ پھر بھی چپ رہی۔۔۔

کسی نے مقابل کے مکان میں لالٹین جلائی،اس کی مدہم سی روشنی کھڑکی میں سے آکر کمرے میں پڑنے لگی۔سلمان نے ثریا پر نظر ڈالی،ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں،گویا آخری بار اس کی تصویر اپنے دل میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو،وہ سیدھا کھڑا ہو گیا،اور اس نے بڑی نارمل آواز میں کہا

اچھا بھئی ثریا اب ہم جاتے ہیں۔صبح سویرے سفر پر روانہ ہونا ہے،ع،،زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے وغیرہ وغیرہ----------

اس نے ذرا ہنس کر اضافہ کیا،،اس نے ہاتھ آگے بڑھایا،

come on shake Hand Like a man

وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دفعتاً اس سے لپٹ گئی۔

سلمان----------سلمان----------سلمان----------اس نے سلمان کے نشانوں سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا،

میں وقتی طور پر قنوطی اور جذباتی ہوگئی تھی۔میں تمہارے ساتھ ہوں، میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ساتھی ہوں، مجھ پر بھروسہ رکھو، میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کروں گی، میں تمہیں کبھی دھوکا نہیں دے سکتی۔

سلمان نے اسے اپنے بازوں میں لیتے ہوئے اس کے گھنگریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا،پھر اس نے بہت آہستہ سے پوچھا،وعدہ؟

وعدہ۔۔۔ثریا نے آنسوں سے بھری ہوئی آواز میں دہرایا۔

ملاؤ ہاتھ،سلمان نے کہا۔۔۔

But not like a man

ثریا نے بیک وقت روتے اور ہنستے ہوئے جواب دیا۔اس کے دل میں مادرانہ شفقت کا سیلاب امنڈ آیا، جو ہر لڑکی اپنے محبوب کے لئے محسوس کرتی ہے۔

صلح سلمان نے دوبارہ پوچھا،

صلح۔۔۔سلمان کریک داس!

کیا میرے وقتی ڈپریشن سے تم اتنا ڈر گئے۔۔۔تمہیں معلوم ہے میں کتنی موڈی ہوں،

کیا کہنے ہیں آپ کے، پکاسو کی خالہ نہیں تو؟۔۔۔اچھا یہ بتاؤ کہ اب تک آسکو گی۔۔۔

جیسے ہی سکول نے استعفیٰ منظور کیا۔ مجھے اپنی خیریت کی اطلاع پہنچتے ہی بھجوا دینا

،،سلمان،،

وہ دروازے میں جا کر چند لمحے اس باہمت لڑکی کو دیکھتا رہا، اور جلدی سے گلی میں اتر گیا۔گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا، اور آخری مرتبہ اس چھوٹے سے مکان پر نظر ڈالی، جسے اتنے برسوں تک اس نے اپنی آرزوؤں اور جدوجہد کا سمبل بنا رکھا تھا۔

یہاں کتنی شامیں اس نے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر جدلیاتی، مادیت اور انقلاب پر بحث کرتے گزاری تھیں۔ثریا کو اپنی پسندیدہ کتابیں لا کر دی تھیں۔ٹالسٹائی، گورکی ،رومن رولاں، جواہر لال نہرو، کرسٹفر کاڈویل، ہارڈ فاسٹ، (جن میں سے بیشتر کتابیں ثریا نے ابتدائی صفحوں سے آگے نہیں پڑھی تھیں ۔ )اس نے ثریا کو اہم مضامین اور اسپین کی خانہ جنگی کے واقعات پڑھ کر سنائے تھے۔وہ پڑھتا جاتا اور وہ ایزل کے سامنے کھڑی تصویریں بناتی رہتی ،بعض مرتبہ وہ جھنجلا کر کہتا۔۔۔

ثریا۔۔۔ثریا۔۔۔تم تو بالکل اسپ جہالت پر سوار ہو۔

سنو،لینن کا نظریہ آرٹ کے متعلق کیا ہے،؟

ثریا احمق نہ بنو۔۔۔۔بد ذوق پڑھا کرو،

ثریا۔۔۔اب کی ٹرم یونیورسٹی جوائن کرلو،

ساری دنیا میری یونیورسٹی ہے،وہ آنکھیں گھما کر بڑے ڈرامائی طریقے سے گور کی جملہ دہراتی،،پھر وہ دونوں خوب ہنستے ---------

ایک رات اس نے ثریا کو جیولیس فیوچک پڑھ کا سنایا تھا، اور کتاب ختم کرنے کے بعد وہ رونے لگا تھا---------

مکمل ذہنی رفاقت، ذہنی ہم آہنگی، کس قدر خوبصورت اور مکمل ترین دوستی ان دونوں کی تھی۔ثریا حسین اور سلمان مرزا۔۔۔ساتھیوں کے حلقے میں کتنے احترام سے ان کا نام لیا جاتا تھا، اس نرم و نازک ذہین اور دل کش حسین بہادر کسان لڑکی

میں سلمان کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ مستقبل کی عورت، آنے والے سماج کی ہیروئن، جو محبوب، بہن، بیوی اور ماں عورت کے ہر روپ میں مکمل ثابت ہو سکتی تھی، اسے کسی خاندانی جلال کے چھینے کسی محل سرا کے جلنے کا شعوری تاسف بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ اس طبقے کی ایک فرد تھی، جسے اپنی زنجیروں کے سوا کچھ نہ کھونا تھا۔۔

اس کے پاس ریشمی ساڑھی ایک نہ تھی، زیورات کے نام سے نا آشنا تھی، پاؤڈر لپ اسٹک سے اسے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ فیشن ایبل سوسائٹی کے ڈنر پارٹیوں کا تذکرہ اس کے وحشت خیز تھی۔ وہ چھوٹی بٹیا کو خاصی قابل رحم ہستی سمجھتی تھی۔ اور ہم دردی کے ساتھ اکثر سوچا کرتی ----------یا اللہ یہ بے چاری ساری زندگی موٹر میں بیٹھ کر پارٹی سے دوسری پارٹی میں جاتے اور سوئمنگ اور رولر اسکیٹنگ کرتے گزار دیں گے۔

سلمان اکثر اپنی بہن سے کہتا۔۔۔ بٹیا چلو آج تمہیں ثریا کے ہاں لے چلیں۔ ڈھنگ کی چار باتیں ذرا تمہارے کان میں پڑیں گی۔

ہرگز نہیں---------- چھوٹی بٹیا جواب دیتیں۔۔۔ ایک بات تو یہ ہے کہ آج ہمارے کالج میں فینسی دریس ہے، دوسرے یہ کہ ثریا باجی اتنی بلندی سے بات کرتی ہیں، کہ ہمیں رونا آجاتا ہے، قسم سے ----------

ثریا کو تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں، اور تم بھی کیا کرو، اپنے طبقے کی نمائندہ لڑکی ہو، وہ ہنس کر کہتا۔

اسی سال ثریا کی تصویریں آل انڈیا نمائش میں دہلی بھیجی گئیں اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام اس کا ون مین شو آلہ آباد میں منعقد ہوا، اور ایل، ایم، سین نے لکھنو سے آکر اس کا افتتاح کیا۔ بڑے بڑے ادیب اور دانشور اس خستہ حال مکان میں اس سے ملنے آتے تھے،

جس کا سارا فرنیچر چند منڈھوں اور دو تین کرسیوں پر مشتمل تھا۔ سلمان کو اس ثریا

پر کتنا فخر تھا، یہ اس کا جی ہی جانتا تھا۔

آج وہ اسی ثریا کو تنہا چھوڑ کر انجانی مدت کے لئے بہت دور جا رہا تھا،

ثریا کے کمرے کی کھڑکی بند ہو گئی۔ اس نے دوسرا سگرٹ جلایا، اور تیز تیز قدم رکھتا ہوا گھپ اندھیری رات میں گلی کے باہر نکل گیا۔

نئی ملک میں پہنچ کر سلمان سال بھر تک روپوش رہا، اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے گھر والے کہاں ہیں۔ ممکن ہے وہ بیاس عبور کرتے وقت مار ڈالے گئے ہوں، لیکن ایک رات اسے اطلاع ملی کہ اس کے والدین اور چھوٹی بہن لاڑکانہ میں مقیم ہیں۔

اپنے لئے حالات سازگار ہوتے ہی وہ لاڑکانہ پہنچا، پرشور گرد آلود بازار میں سے گزرتا سندھی عالموں کے ان سارے مکانوں پر نظر ڈالتا ہوا۔ جن میں اب یوپی کے مہاجر رہتے تھے، وہ بالآخر اس پتے پر پہنچ گیا، جو اسے اطلاع میں بتلایا گیا تھا۔

یہ کسی ہندو بنیئے کا مکان تھا۔ دروازے پر ہنومان جی، گنیش جی اور لکشمی کی مورتیاں نصب تھیں، سیڑھیوں پر عجب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

اس نے دھڑکتے دل سے اندر جھانکا۔ ماما صحن میں انگیٹھی رکھے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ بابا پلنگ پر لیٹے کچھ پڑھ رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں اندر آ گیا۔

بھیا---------بابا نے دیوان حافظ ایک طرف رکھتے ہوئے تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا، ہم تمہارے استقبال کے لئے اٹھ نہیں سکتے، کیونکہ ہمارے پاؤں مفلوج ہو گئے ہیں۔

بھیا کچھ دیر بعد ماما نے اس کے آگے کھانا چنتے ہوئے کہا، اگر ممکن ہو تو کراچی میں مکان لے کر ہم لوگوں کو وہاں بلا لو، یہاں ان کے علاج کی بڑی دقت ہے۔ دنیا

بھر کی بیماریوں نے انہیں آن گھیرا ہے۔

پرونشل سروس والوں کی پنشن کے کاغذات ابھی سرکاری دفتروں میں اٹکے پڑے ہیں۔قصر سلمان متروکہ جائداد قرار دے دیا گیا---------- آلہ آباد بنک نے اطلاع دی ہے، کہ اکاونٹس انہوں نے منجمد کر لیے ہیں۔تاوقتیکہ دونوں ملکوں میں موویبل پراپرٹی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہیں ہو جاتا، تمہاری ماما کی زمینیں زمین داری کے خاتمے کے ساتھ چلی گئیں وغیرہ وغیرہ،

بابا نے بڑے اطمینان کے ساتھ بتایا، انہوں نے اضافہ کیا،

نہ عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا ،

چھوٹی بٹیا سکول پڑھا کر لوٹیں، انہوں نے سلمان کو ہکا بکا ہو کر دیکھا، وہ بہت دبلا اور کالا ہو گیا تھا۔چھوٹی بٹیا کی رنگت بھی صحرا کی دھوپ میں کملا چکی تھی، دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔

دوسرے روز چھوٹی بٹیا نے بھی سلمان سے کہا،

بھیا اگر ہو سکے تو ہمیں بھی کراچی لے چلو، ہماری پڑھائی کا دوسرا سال برباد جا رہا ہے۔

کوئی جگہ وہاں سنا ہے، الٰہی بخش کالونی کہلاتی ہے، وہاں کواٹروں کے کرائے سستے ہیں۔وہیں انتظام کرو، ہم سے پیسے لیتے جاؤ۔ماما نے کہا،

پیسے ہیں؟، سلمان نے دریافت کیا----------

مسوری سے نکلتے وقت جو گہنے ساتھ تھے، وہی اب تک فروخت ہو رہے ہیں، چھوٹی بٹیا گریجویٹ نہیں ہیں، اس لئے ان کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے، ماما نے جواب دیا،

بٹیا کو بی، اے، بی، ٹی کر لینا چاہیئے، بابا نے کہا

بھیا جاتے ہی مکان ڈھونڈنا،،

ماما نے کہا،،

جی اچھا۔۔۔

چائے پی لو،

جی اچھا۔۔۔

کراچی میں اپنے کھانے پینے کا خیال رکھو،

جی اچھا۔۔۔

وہ مدتوں سے اس طرح کی ادائی توائی اور خطرناک زندگی گزار رہا تھا، میم صاحب بظاہر اس کی عادی ہو چکی تھیں۔ مگر دل میں بری طرح کڑھا کرتیں، ان کے چاند سے بیٹے نے کیسی بھگل گانٹھ رکھی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کا دل خون ہو جاتا، ان کے کیسے کیسے ارمان خاک میں مل گئے تھے، وطن میں تھیں تو سارے ہم چشم در در پھٹ پھٹ کرتے تھے۔ خاندان کی بی بیاں الاہنا دیتیں۔۔۔ انجمن آرا کا اکلوتا بیٹا آوارہ نکل گیا۔ روز دوڑاتی ہے۔ تین بار چھ چھ مہینے کا کاٹ چکا ہے۔ ایسے لڑکے کو کون اپنی بٹیا دے گا،

وہ خود ثریا سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔۔۔ بے چاری بوٹا بیگم خود تو اللہ کا جی تھیں۔ ۔۔لڑکی بڑی ہو کر ایسی بے تکی نکلے گی،

بھیا کو تو ایسی لڑکی چاہیئے تھی، جو انگچوئل، سوشلسٹ، آرٹسٹ و آرٹسٹ کچھ نہ ہو،

بلکہ ان کے آرام اور کھانے پینے کا خیال رکھے، میم صاحب نے ایک دفعہ اظہار خیال کیا تھا،

خیر ثریا باجی اتنی انگچوئل بھی نہیں ---------- چھوٹی بٹیا نے ذرا جل کر جواب دیا

-

بے چاری ثریا کے متعلق تم یہ خالص نندوں والی جلی کٹی نہیں کرو گی تو اور کون

کرے گا---------سلمان نے قہقہہ لگا کر کہا تھا،،

ثریا باجی آ گئیں ۔ ۔ ۔ چھوٹی بٹیا نے دفعتاً سوال کیا، ،معلوم نہیں سلمان نے جواب دیا،،

پھر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا، ہم دوپہر کی ٹرین پکڑ لیں تو اچھا ہے۔ پرسوں صبح ایک اخبار کی ملازمت کا انٹرویو ہے۔ اتنی مایوس نہ ہو بٹیا،، حالات اتنے بھی خراب نہیں ہیں۔ اس نے پیار سے بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور ماں باپ سے رخصت ہوا۔

باہر جھکڑ چل رہا تھا، زرد رنگ کی جلتی جلتی ریت آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ تارک وطن ہندوؤں کے رنگ برنگے ٹائیلوں والے مکانوں کی چھتوں پر بادگیر کے جنگل کھڑے تھے، اور گرم ہوا بادگیر سے ٹکرا ٹکرا کر سیٹیاں بجا رہی تھی۔ گلیوں میں مہاجر چل پھر رہے تھے۔ روزانہ کھوکھرا پار عبور کر کے راجھستان، دلی، اور یوپی کا ایک نیا پریشان حال قافلہ ان محلوں میں چھاؤنی چھاتا، کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر لوگ ہندوستان سے نکلے تھے، اور یہاں ان کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا تھیں۔ سلمان نے اسٹیشن کے راستے پر چلنا شروع کیا، سرخ رنگ کی عبائیں پہنے سندھی عورتیں خچروں پر بیٹھی سامنے سے گزر گئیں۔ چائے خانوں میں ثریا اور شمشاد بیگم کے ریکارڈ چیخ رہے تھے۔ ایک غلیظ سے رسٹوران میں جس کا نام کیفے ڈی پیرس کا بورڈ لگا تھا، رام پور کے چند مہاجن ٹین کی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے زور زور سے چیخ رہے تھے۔

ابے چھن خان میں نے کیا۔ اکیلے اکیلے مکان الاٹ کرا لیا۔ یاروں کو ہوا بھی نہ لگنے دی۔ میاں اگر تم نے اڑائی ہیں، تو ہم نے بھون بھون کر کھائی ہیں۔ ہمیں بتا بتاتے ہو، چھنمن میاں سے نہ کہہ دیا ہو،

امین جاؤ یار۔ ۔ ۔ ۔ یہاں ریاضت چن خاں بھی کسی سے ہیٹے نہیں ہیں، اپنی بات کرو۔

کھال میں رہو، کھال میں،، میں نے کہا،

وہ آگے بڑھتا گیا، بازار میں چوطرفہ غل مچا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں، رنگا رنگ لہجے۔ رنگ برنگے لباس، خوانچے والوں کی صدائیں، ہر شخص نئی سرزمین پر زندہ رہنے کے لئے ازسرنو زندگی شروع کرنے کے لئے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔سلمان نے سامنے کے منظر کو دیکھا، اور سر اٹھا کر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

اسٹیشن پر بھی مسافروں کی ریل پیل تھی، سلمان ان کو دیکھا کیا۔ یہ جانے کون کون لوگ ہوں گے۔ کہاں کہاں سے آئے ہوں گے۔ پورب اور بہار کے باشندے جن کے چہروں پر انمٹ اداسی تھی۔ گول مخملی ٹوپیوں اور مخملی واسکٹوں والے رام پور اور بریلی کے بانکے، مراد آباد کے برتن فروش، علی گڑھ کے قفل گر۔۔۔ فیروز آباد کے چوڑی والے۔ فرخ آباد کے رنگ ریز، لکھنو کے زردوز اور شاعر، دلی کے کرخندار، اعظم گڑھ اور بنارس کے جولاہے، مزار پور کے قالین باف، ان کی برقعہ پوش بیویاں اور بچے۔۔۔

ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی، وہ پلیٹ فارم پر بیٹھ کر اس گھمسان کا نظارہ کرتا رہا، وقت گزارنے کے لئے کوئی رسالہ خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں تھے، اس نے سندھی کی تیسری کتاب نکالی۔

پیر الٰہی بخش کالونی کے اس دو کمروں کے مکان میں دونوں طرف کیچڑ اور گڑھے تھے۔ صحن کے پچھواڑے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ کمروں کی دیواریں بے حد میلی تھیں۔ اور کواڑوں میں شیشے کی جگہ اخبار کے کاغذ اور گتے چپکا دیئے گئے تھے۔ آس پاس بھی زیادہ تر مہاجر آباد تھے۔ جو زیادہ تر سرکاری ملازم تھی، ان کی زندگیاں خاصی بے آرام تھیں، مگر ایک عجیب وغریب ولولہ اور قومی جوش سارے میں طاری تھا۔

چھوٹی بٹیا بی، اے کے لئے کالج میں داخل ہو گئیں، سلمان کو ان کی طرف سے بہت فکر تھی۔ اپنے ڈی کلاس ہونے پر کڑھتے کڑھتے انہوں نے اپنی صحت تباہ کر لی

تھی۔

ایک روز کالج سے لوٹ کر انہوں نے کہا۔۔

ماما۔۔ہمیں ایک کالا برقعہ بنوا دیجیئے!

کیا۔۔۔سلمان نے چونک کر پوچھا، جو پلنگ پر لیٹا پاؤں ہلا ہلا کر اخبار پڑھ رہا تھا۔۔

بس میں سب لوگ ہمیں بری طرح گھورتے ہیں۔ہمیں سخت شرم آتی ہے۔بس سٹاپ پر کھڑے ہوتے ہیں جو جی چاہتا ہے، کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں۔سب کی نظریں تیر کی ایسی چبھتی ہیں۔

برقعے میں کسی کو پتا نہ چلے گا کہ کون جا رہا ہے۔اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔

سلمان اٹھ کر بیٹھ گیا----------

اور ایسی ایسی بسیں جن کو دیکھ کر دل دہلتا ہے۔چھوٹی بٹیا نے پلکیں خشک کرتے ہوئے کہا،

ان بسوں میں تمہارے جیسے انسان ہی سوار ہوتے ہیں، بٹیا تم ان انسانوں سے قطعی مختلف نہیں ہو، سلمان نے کہا----------

بٹیا، بابا نے چارپائی سے کہا۔۔۔یہ تمہارا خیال ہے، تمہیں چھوٹی بٹیا سمجھ کر کوئی نہیں دیکھتا، لوگوں کو تمہاری اتنی پرواہ نہیں ہے۔انہیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں۔

لیکن بابا پرانے شناساؤں کے سامنے کتنی بے عزتی ہے۔

ہماری رضیہ باجی ہمیں روز بس اسٹاپ پر کھڑا دیکھتی ہیں، اور زن سے کار میں نکل جاتی ہیں۔۔۔اور آج۔۔۔

آج ہم گھنٹہ بھر بس کا انتظار کرنے کے بعد ہم پیدل صدر کی طرف آ رہے تھے، تو وہ ٹیبل ٹینس چمپین نہیں ہیں، عالیہ سید۔۔۔انہوں نے کار روک لی اور کہنے لگیں

۔دھوپ بہت تیز ہے ۔آیئے میں آپ کو لفٹ دے دوں،شکر ہے کہ وہ ہمیں جانتی نہیں، اتنا کہہ کر وہ سوں سوں کرتی منہ دھونے غسل خانے چلی گئیں،

کراچی پہنچ کر جمشید نے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دوست کے اشتراک سے ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار شروع کر دیا۔اور میکلوڈ روڈ پر ایک مترو کہ دفتر حاصل کر لیا، وہ ہندو تاجروں کے انخلا کا زمانہ تھا۔اس لئے اسے اپنا کاروبار جمانے میں بہت آسانی رہی۔جنوری ۴۸ء کے بلوے کے بعد ایک دومنزلہ کوٹھی عامل کالونی نمبر۲ میں خالی ہوئی۔اس نے اپنے نام الاٹ کروالی۔اس نے بڑی محنت اور توجہ سے اپنا کاروبار پھیلایا،اور ڈیڑھ سال کے اندر اندر کراچی کی نئی دنیا میں اس کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔

دوسرے سال وہ کان پور گیا اور اس نے اپنی ماں سے کہا،

اصغر اور انور کے امتحان ختم ہو جائیں تو ان کو ساتھ لے کر چلے آیئے گا، ورنہ عالیہ اور آپ میرے ساتھ ہی چلی چلیں۔یہ لوگ بعد میں آجائیں گے، میں نے ایک بہت اچھے سینی ٹوریم میں آپ کے داخلے کا انتظام کر دیا ہے،۔۔

اور فرحت بٹیا کو دیکھے محمد گنج نہ جیو۔۔؟

میرے پاس وقت نہیں ہے، میں مصروف آدمی ہوں۔آپ لوگ فوراً میرے ہمراہ چلے آیئے ،ورنہ بعد میں آجایئے گا۔

اگلے ہفتے وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر کراچی آ گیا، عالیہ کان پور سے بی،اے کر چکی تھی۔یہاں آ کر اس نے ایم،اے میں داخلہ لیا۔وہ کان پور کالج میں بھی ٹیبل ٹینس کے کئی مقابلے جیت چکی تھی۔یہاں وہ بہت جلد یونیورسٹی چمپئین بن گئی

۔

جمشید نے نوعمری ہی میں آئی،سی،ایس کہلانے کے جو خواب دیکھے تھے۔وہ اس کو اب تک نہ بھولے تھے۔وہ لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔مگر جانتا تھا کہ بڑے افسر

کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اس نے طے کرلیا کہ چھوٹے بھائی کو سی۔ ایس۔ پی، کے امتحانات دلوائے گا۔

بزنس مین کا ایک بھائی اعلیٰ عہدے دار بھی ہو تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے،

اپنی فرحت النساء کو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا، کچھ دنوں سے اس کے خیال نے جمشید کو بری طرح ستانا شروع کر دیا، اس کی بچی ج و بہت دور کسی دوسری دنیا میں ایک پسماندہ گاؤں میں ایک غربت زدہ کچے گھر میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چچا ابا کو خط لکھا۔ ویزا بنوایا اور ہندوستان روانہ ہو گیا۔

گیارہ برس کے طویل عرصے کے بعد جمشید محمد گنج پہنچا، وہ ۱۴ء میں منظور النساء کو بیاہ لے جانے کے لئے آخری بار یہاں آیا تھا۔ اسٹیشن پر اتر کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ گوبندوا یکہ لیے ابھی تک اس کے انتظار میں اسی طرح کھڑا ہے۔ گویا وہ دسہرے کی چھٹیوں میں اسکول سے گھر آیا ہو۔

بھیا آئے گھنیں۔۔ گوبندوا نے آگے بڑھ کر کہا۔

گوبند۔۔ چاچا۔۔۔ اس نے ذرا جھجکتے ہوئے چاچا کے لفظ کا اضافہ کیا۔۔۔ تم کیسے آئے۔۔۔؟

چھوٹے شاہ جی بتائے رہن کی کہ آج کی گاڑی آوت ہو۔

جمشید نے یکے پر چڑھتے وقت ذرا دقت محسوس کی، اور ذرا جھینپ کر اپنی قیمتی پتلون کی کریز پر نظر ڈالی۔

سید مظہر علی کے مکان پر تقریباً سارا گاؤں جمع تھا۔ شمبھو دادا، شیخ رمضان، مولوی محمد حسین، توقیر میاں، پنڈت لچھمی نرائن، گوبر دھن چاچا، رحمت بھیا، گوسائیں کا کا، اور جانے کون کون۔ بچے جوان ہو گئے تھے۔ جوان ادھیڑ ہو چلے تھے۔ اور بوڑھے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ گوبر چاچا نے اسے گلے لگایا اور بھوں بھوں کر کے

روئے ۔ جھنگا پاسی کی خوشی کے مارے باچھیں کھلی جا رہی تھیں ۔ اور وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے بھیا کو تک رہا تھا ۔ ساری بستی میں اودھم مچی تھی ۔ ۔ ۔ جمشید بھیا پاکستان سے آئے ہیں ۔ بڑے رئیس ہو گئے ہیں ۔

یہ بڑی سونے کی گھڑی لگائے ہیں، بالکل جنٹ صاحب معلوم ہوتے ہیں ۔

جمشید کی نظروں نے بہت سے مانوس چہروں کو تلاش کیا، جواب موجود نہ تھے، چپاتی بھانڈ مر چکا تھا ۔ سلامو ہیوڑن مر چکی تھی ۔ جونکڑ پر پان سگرٹ بیچا کرتی تھی ۔ نواب منن خاں اب بھی ڈاکے ڈالتے تھے ۔ اور ان دنوں جیل گئے ہوئے تھے ۔

منظور النساء کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ جمشید آنے والے ہیں ۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں پھرتی رہی تھی ۔ اس نے دالان اور کوٹھی کی تن دہی سے صفائی کی تھی ۔ گھر کے سارے برتن مانجھ مانجھ کر چمکا دیئے تھے ۔ جھینگا پاسی کی عورت کے ساتھ مل کر سارا دالان اور صحن لیپا تھا ۔ پلاؤ اور فیرنی کے لئے چاول صاف کیے تھے ۔ آدھی رات سے اٹھ کر صبح کا ناشتہ تیار کیا تھا ۔ اس کے ماں باپ اس کی یہ سرگرمی اور مصروفیت دیکھتے اور غم سے سر جھکا لیتے ۔ فرحت النساء کے لئے اس نے تین دن اندھیرا پڑے تک صحن میں بیٹھ کر ہاتھ سے نیا جوڑا سیا تھا ۔

ٹرین کے آنے کا وقت ہوا، تو منظور النساء نے لڑکی کو نہلا دھلا کر گوٹے لچکے کا نیا جوڑا پہنایا ۔ اس کے بالوں مین تیل لگا کر مینڈھیاں گوندیں، ناشتے کا سامان تخت پر چنا، اور خود اسی طرح بکھرے بالوں کو میلے دوپٹے میں سمیٹتی، چہرے کا پسینہ خشک کرتی کوٹھے پر چلی گئی ۔ وہاں چھت کی منڈیر سے لگ کر بیٹھ گئی ۔ اور پرنالے کے موکھے میں سے اسٹیشن کی طرف سے آنے والی سڑک کو تکتی رہی ۔ جب جمشی دیکے سے اترا تو منظور النساء نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا اور لرزتی رہی ۔ جمشید نے سید مظہر علی کو جھک کر سلام کیا، اور گاؤں والوں سے گلے ملا ۔ اور اندر آ کر اپنی بیٹی کو لپٹا لیا ۔

شاہ منور علی خانقاہ کے حجرے میں سے باہر نکل آئے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔ اور پھر خانقاہ واپس چلے گئے۔ سید اختر علی کو بلانے بہت سے لوگ دوڑے مگر گومتی کے کنارے ان کی جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ وہ غائب ہو چکے تھے۔

جمشید ہفتہ بھر وہاں رہا، اور سارے وقت اس نے سید مظہر علی اور ان کے احباب کو کراچی کی ایسی ایسی محیر العقول داستانیں سنائیں، کہ ان لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بڑی مشکل اور محنت سے اس نے ان بوڑھوں کو ایکسپورٹ، امپورٹ، بلیک مارکیٹ، لائسنس، پرمٹ، اور الاٹ منٹ کے معنے سمجھائے۔۔۔ سمجھ گئے پگڑی تو یوں جانو جئیں ہم چیچ کے یہاں صاحب لوگ ڈالی ہوت رہی۔

شمبھو دادا نے سر ہلا کر کہا----------

بجز بھینٹ نہ کہو، پگڑی کہہ لیو۔۔۔

ای سب تو ہم جانت ہیں۔

پنڈت پچھمی نرائن مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

اس پوری محفل میں محض واقف اسرار تھے، کیونکہ ان کا بھانجا کئی برس سے دلی میں ٹھیکے لے رہا تھا۔ اور اب اس نے بمبئی میں بزنس ایکسپورٹ امپورٹ شروع کر دی تھی۔ اور ایک دفعہ اس نے محمد گنج آ کر اپنی ماما کو دہلی اور بمبئی کی بے انتہا محیر العقول داستانیں سنائی تھیں۔ ہمرے گاؤں سے خالی دوئی ٹھونی بہوتے قابل نکسے ہن، توقیر میاں نے فخریہ کہا۔ ایک تمہر اھیگو اور ایک ایک جمشیدوا۔۔۔

اسلامی دارالخلافہ ہے۔ کراچی میں مساجد تو ایک سے ایک شاندار بن گئی ہے۔

۔۔مولوی محمد حسن نے کہا---------

جی جمشید نے مختصراً جواب دیا۔

انگریزوں کو بڑی دقت پڑتی ہوگی، تمہارے لئے جہاں۔ مولوی صاحب نے

مزید اظہار خیال کیا

کیوں جمشید نے پوچھا۔

ارے ام الخبائث جو ممنوع ہوگئی۔ ماشااللہ سے اسلامی ہے۔

جمشید نے دل میں سوچا، اگر ان بے چاروں ک ومعلوم ہو جائے کہ ان کا عزیز بھتیجا کراچی جم خانہ میں روزانہ شام کو گھڑوں وہسکی انڈھاتا ہے۔ جی نہیں،

ابھی تو ممنوع نہیں ہوئی ----------جمشید نے ذرا بے تکلفی سے کہا----------

ہمارے کے ہاں تو لگ گئی ہے پابندی۔۔۔مولوی صاحب نے کہا۔۔

پابندی سے کیا ہوت ہے! پنڈت لچھمی نرائن نے ج وواقف اسرار تھے، کہا، پھیگو بتاوت رہا کی، لوگ اب لک چھپ کے پہلے سے اور جیاستی پیت ہیں دارو----------

پابندی کیا شے ہے، جمشید نے فلسفیانہ انداز سے سوچا،

اخلاقی، سیاسی، مذہبی پابندیاں۔۔۔گزر گیا اب وہ دور کہ ساقی چھپ کے پیتے تھے۔۔ پینے والے۔۔۔

بنے گا سارا جہاں مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا۔۔اس نے دل میں دہرایا، مگر اب اس کا دماغ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔وہ پھر محمد گنج کی نیم تلے واپس لوٹا۔

بھیا تنک ہی تو بتاؤ تمہارے کے ہاں قومی پہناوا کیا ہے؟ تو قیر میاں نے سوال کیا۔

ہمارے کے یہاں تو افسران کو حکم مل گیا ہے، کہ ولایت جائیں، تو قومی پہناوا پہنیں۔۔

وہ مدینہ (بجنور) اور قومی آواز لکھنو باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔

پاکستان میں تو مستورات پردے میں رہتی ہوں گی اسلامی ملک ہے۔

مولوی صاحب نے کہا۔۔

ہمارے کے ہاں تو آزادی کی ہوا بہت چل گئی ہے۔

شیخ رمضان، توقیر میاں اور دوسرے مسلمان بوڑھے پاکستان کی باتوں کو بہت عقیدت سے سن رہے تھے۔

فرحت النساء کیا پڑھ رہی ہے۔جمشید نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کے لئے اپنے چچا سے استفسار کیا۔

ہم خود پڑھاتے ہیں، اردو اور قران شریف۔شمبھو بھیا انگریزی بھی پڑھاتے ہیں۔اے، بی، سی، ڈی، گوسائیں بابا اسے ہندی پڑھاتے رہے ہیں۔سید مظہر علی نے بڑے فخر سے کہا۔جمشید کو ایسا محسوس ہوا، جیسے گاؤں کے لوگ اس کی بیٹی کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔وہ کہنے ہی والا تھا، کہ اس کا ارادہ ہے کہ کراچی لے جانے کے کچھ عرصہ بعد وہ فرحت النساء کو تعلیم کے لئے سوئٹزرلینڈ بھیج دے گا۔مگر اب چچا ابا اور شمبھو دادا اور گوسائیں کاکا کو یہ بتاتے ہوئے اسے بے حد شرم آئی، جیسے وہ ان افلاس زدہ لوگوں کا مذاق اڑانے والا ہو۔اپنی پستی اور ان معصوم لوگوں کی بلندی کا اسے شدت سے احساس ہوا، اور وہ سر جھکا کر چبوترے پر نیم کے پتے سے لکیریں کھینچنے لگا۔

منظور النساء کا اس سے پردہ تھا، مگر جب تک وہ یہاں رہا، وہ کواڑوں کی درزون سے چھپ چھپ کر اسے دیکھا کی۔ایک بار اس کی ماں نے اسے اس طرح جھانکتے دیکھ پایا، تو وہ اس پر برس پڑیں ----------

اری جنم جلی بھیا، اب تیرے لئے نامحرم ہیں، تیرے سامنے ہوگوا تو گناہ ہوئیے ۔پاپ ہوئیے ----------

نامحرم آئیں۔۔۔ہمرے چچا کے پوت تو ہوں، منظور النساء نے غم و غصے سے

کھولتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔۔

بے حیا، بے شرم، بے غیرت، سید مظہر علی کی بی بی بکتی جھکتی مہمان کے لئے پلاؤ دم کرنے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

منظور النساء وہیں کواڑ سر لگ کر زمین پر بیٹھ گئیں، اور بلک بلک کر آہستہ آہستہ روتی رہیں۔

جمشید فرحت النساء کو محمد گنج سے اپنے ساتھ کراچی لے آیا، وہاں پہنچتے ہی اس کے لئے ایک اینگلو انڈین گورنس مقرر کی، اور اسے ایک اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ سکول میں داخل کرا دیا۔ عالیہ نے بھتیجی کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی، اب وہ گھر میں اور سکول میں فیری کہلاتی تھیں۔ اور چند سال کے اندر بڑی سمارٹ اور تیز و طرار بن چکی تھی، جو تنگ موریوں کی شلوار، بغیر آستین کے نہایت چست قمیض پہنتی تھی۔ اور دوپٹے کی بجائے ایک قسم کا پٹا سا کندھے پر لٹکائے رہتی۔ اور راک اینڈ رول کی ماہر تھی۔ اپنے نانا کے آنگن کو اس نے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کیا،

عالیہ گاہے گاہے سید مظہر علی کو یہاں کی خیر خبر سے مطلع کرتی رہتی۔

آج بھیا نے نئی کار خرید لی ہے۔ ماشاءاللہ سے چالیس ہزار کی آتی ہے۔ کل بھیا کاروبار کے سلسلے میں یورپ روانہ ہو گئے۔ یہ بھیا کا یورپ کا چوتھا سفر ہے۔

میں اگلے مہینے نیویارک جا رہی ہوں۔ یہ امریکہ میں بہت بڑا شہر ہے۔

فیری بیٹا سکول کی لڑکیوں کے ساتھ مری گئی ہوئی ہے۔ یہ مغربی پاکستان کا ایک پہاڑی مقام ہے۔

میں یہ سطریں پرسکون اور ہرے بھرے سلہٹ میں ریسٹ ہاؤس میں لکھ رہی ہوں۔ سامنے ڈھلوان سرمائی بہہ رہی ہے۔

عقب میں درختوں سے گھری ایک بہت بڑی جھیل ہے،

پہلو میں ندی کے سرخ رنگ کے عظیم الشان اور بلند و بالا آہنی پل پر سے راہ

گیروں، سائیکل رکشاؤں اور اکادکا موٹروں کالامتناہی جلوس گزر رہا ہے۔

میں کھڑکی کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر دن بھر تم کو یہ خط لکھتی رہوں گی۔اور پھر اسے اپنے ٹرنک کی تہہ میں چھپا دوں گی۔پچھلے برسوں میں میں نیا س طرح کتنے ان گنت مفصل خط لکھ کر بکس میں مقفل کر دیئے یا تلف کر دیئے۔ان مختصرا اکادکا سطور میں جو ہم فرضی ناموں سے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں۔

ان کے رمزو کنائے ،مبہم الفاظ ،تلمیحات ،اور محتاط استعاروں میں تم سے باتیں کرنے کی کوشش میں جب میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔تو میں بیٹھ کر لمبے چوڑے کھرے خط تمہیں لکھتی ہوں۔جب بھی تم سے بلاکم وکاست اور مفصل باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے،تو میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتی ہوں،اور سوچتی ہوں،کاش یہ پلندے تم تک پہنچ سکتے۔مگر مجھے یقین ہے ایک دن ایسا آئے گا کہ میں یہ پلندے تمہیں پڑھنے کے لئے دوں گی۔تا کہ یہ سارے طوفانی دفتر تمہیں پڑھا کر تم سے ہم کلام ہوسکوں۔ابھی سرکٹ ہاؤس کا چھدری داڑھی اور لمبے لمبے دانتوں والا شفیق بوڑھا بیرہ میرے لئے چائے لے کر آیا تھا۔اور وہ مجھے اپنے گاؤں کے اور سلہٹ کے اولیا کے بڑے دل آویز قصے سنایا کرتا ہے۔

رات کو سلہٹ کے بازار میں دور دور تک شمعیں جلتی ہیں۔بڑا عجیب،غیر حقیقی، پرستان کا نظارہ ہوتا ہے۔سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں غدر کے وقت کسی انگریز فوجی افسر کی قبر ہے۔اس کے چاروں طرف سبز گھاس پر ایک گائے سارا دن چرا کرتی ہے۔یہاں پر کس قدر سکون ہے،کل میں نے سارا دن باغوں میں گھوم پھر کر اسکیچ بنائے۔آج مجھے مشرقی پاکستان آئے ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں،لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کل کی بات ہو۔

۴۹ء کے آخر میں مجھے اطلاع ملی تھی کہ تم مشرقی پاکستان میں ہو،اس مبہم سی خبر کے بھروسے پر میں نے سکول سے استعفیٰ دے دیا،اور ڈھاکے آ گئی ،پہنچ کر مجھے

معلوم ہوا کہ وہ اطلاع غلط تھی۔ یہاں میں نے وہی جدوجہد اور محنت کی زندگی بسر کرنا شروع کی جس کی وجہ سے تم کو مجھ پر اتنا فخر ہے۔اور جس سے میں اب بری طرح تھک چکی ہوں میرے کانوں میں تمہاری آواز گونجتی ہے۔۔۔خدا جانتا ہے ثریا تم زندگی میں تھوڑے سے آرام، تھوڑی سی آسائش کی مستحق ہو۔کئی بار ایسا ہوا ہے کہ جب پدما کے پانیوں میں میری کشتی پہنچتی ہے، تو بے اختیار میرا جی چاہا کہ ندی میں کود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں، لیکن پھر تمہاری آواز میرے کانوں میں آتی ہے، تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہوں؟ ۔۔ہمیں مایوس نہ کرنا، بہادر لڑکی،، سپاہی لڑکی----------

بعض اوقات میں سوچتی ہوں، کہ یہ سب بکواس ہے، تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم جھک مار رہے ہو، میرا بھی دماغ خراب ہے۔ میں بھی جھک مار رہی ہوں۔مگر پھر مستقبل کا بھروسہ آڑے آتا ہے، خود کو یقین دلاتی ہوں کہ زندگی میں ایک نہ ایک روز مجھے بھی ضرور خوشی ملے گی۔امید بھی کیا چیز ہے۔۔اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا،

آج کل سکول میں چھٹیاں ہیں، جہاں میں آرٹ ٹیچر ہوں، میں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ سلہٹ آئی ہوں، اس کا شوہر یہاں دورے پر آیا ہے۔وہ دونوں کل سے مولوی بازار گئے ہوئے ہیں۔اور میں آج دن بھر تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔

مشرقی بنگال کتنا خوبصورت ہے، یہاں کے لوگ کتنے پیارے ہیں، کبھی ایسا ہوگا کہ تم میرے ساتھ ہو گے، اور میں تمہاری موجودگی میں، ان جنگلوں اور ان ندیوں کی تصویر بناؤں گی۔

تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا،، یار لوگوں نے اڑا دیا ہے کہ میرے فن کا بنگالی پیریڈ شروع ہو گیا ہے۔بکواس،،

میں تو اپنی زندگی کا اہم ترین خوبصورت پیریڈ شروع کرنا چاہتی ہوں۔اور تمہیں

خوب معلوم ہے اس پیریڈ کا نام کیا ہوگا۔ ڈھاکا میں میری دو نمائش ہو چکی ہیں۔ تمھارے بغیر یہ سارا گورکھ دھندا کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

آج میری اکتیسویں سال گرہ ہے، یعنی آج سے اکتیس سال پہلے میں اس آنسوؤں کی وادی میں روتی چلاتی داخل ہوئی تھی، یعنی جس ماحول میں میں نے آنکھیں کھولیں، وہاں چاندی کے شمع دانوں کی بجائے شکستہ الٹینیں تھیں۔۔ پپی برتھ ڈے کے سروں کی بجائے گائے بیلوں کے گلوں کی گھنٹیاں تھیں۔ اور چاکلیٹ کیک کی بجائے اوپلے تھے۔ میری اس دنیا میں سال گرہ کے جشن نہیں منائے جاتے تھے۔

تم جس طلسماتی دور میں پیدا ہوئے، وہاں قصر سلمان میں تمہاری برتھ ڈے پر دھوم کی فینسی ڈریس پارٹی منعقد کی جاتی تھی۔ بہرحال آج اس وقت پہلی بار میں اپنی پہلی سال گرہ منا رہی ہوں۔ اور سال گرہ منانے کا طریقہ میں نے یہ سوچا ہے کہ تم کو اکتیس صفحے کا خط لکھوں گی۔ اور اس کے بعد اڑتیس صفحے کا اس میں مزید اضافہ کروں گی، جو تمہاری عمر کے اعداد ہیں۔ اس حساب سے ہم دونوں کی مجموعی عمر انہتر سال ہے۔ یعنی تم اور میں انہتر برس کے بوڑھے ہیں، ابھی میں نے آنکھیں بند رکر کے تصور کیا ہے کہ ہم دونوں نے یہ انہتر برس اکٹھے گزارے ہیں۔ جوانی کے خواب اور ولولے اور جنون خیزیاں۔۔ پختہ سالی کا جذباتی توازن، بڑھاپے کا آرام اور سکون، رفاقت اور دردمندی۔۔

Clame of Mind all passionsPent!

پچھلے ہفتے یہاں آ کر جب میں قمر جہاں کو ایک مختصر سا خط پوسٹ کرنے گئی، تو مجھے ڈاک خانے کا رستا معلوم نہ تھا، اور میں سڑک پر چلتی ہوئی ایک سرکاری بنگلے میں داخل ہوگئی۔ جسے دور سے میں ڈاک خانہ سمجھی تھی، میں سیدھی کمرے میں چلی گئی۔ اور وہاں ایک شکستہ سا گاؤن پہنے ایک بنگالی وکیل مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا اجرح کر

رہا ہے ۔ میں ضلع کی عدالت میں گھس گئی تھی ۔ اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میرا اور تمہارا ۔۔۔ ہم دونوں کا عدالتوں سے کتنا تعلق رہا ہے ۔

تمہارا آخری خط مجھے چھ مہینے ہوئے ملا تھا، جس میں تم نے صرف اتنا لکھا تھا، پرسوں رات بابا کا انتقال ہوگیا ، اگر تم اس وقت ہمارے پاس ہوتیں ،تو ہم اپنی آنکھیں ہاتھوں میں چھپا لیتے اور خوب روتے ۔

بابا نے کبھی اس کا شکوہ نہیں کیا کہ اگر ان کا بیٹا کہیں افسری کر رہا ہوتا ،تو ان کو یہ مصائب نہ جھیلنا پڑتے ۔

اس کے بعد سے تم بالکل خاموش ہو ۔ نظر بندی کی گزشتہ مدتوں میں تم مجھے برابر لکھتے رہے ہو ۔ سوچ سوچ کر باؤلی ہوئی جا رہی ہوں ،

اب سرماندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی ہے ،اور بازار میں موم بتیاں جھلملانے لگی ہیں ----------اور ----------

جمشید اپنے ڈرائنگ روم میں چند مہمانوں کے لئے کاک ٹیبل تیار کر رہا تھا ، جب نوکر نے آکر اطلاع دی ۔

صاحب کوئی بڑے میاں آئے ہیں، کہتے ہیں، کہ آپ کے والد ہیں ۔۔،،

میرے والد ----------جمشید جلدی سے باہر آگیا ۔

نارنجی کفنی میں ملبوس سید اختر علی موٹر رکشا میں بیٹھے تھے ،چھوٹا سا ٹین کا بکس ، دری میں لپٹا ہوا بستر اور لوٹا ان کے قدموں میں رکھا تھا ۔

انھوں نے آنکھیں اٹھا کر جمشید کو دیکھا اور مسکرائے ۔

ہمیں بشارت ہوئی تھی کہ پاکستان چلے آئیں ،انہوں نے اطمینان سے کہا ۔۔

میں یہ اہم اطلاع تمہیں بھجوا رہی ہوں ، کہ میں عنقریب کراچی پہنچنے والی ہوں ۔ یہ چند سطریں میں تم کو نرائن گنج جاتے ہوئے لانچ میں لکھ رہی ہوں ۔ میں نے اتنا روپیہ جمع کر لیا ہے کہ کراچی پہنچ سکوں اور جب تک کام نہ ملے میں ۔۔۔۔

---

ایک روز چھوٹی بٹیا سکول پڑھا کر لوٹیں، تو انہوں نے چائے پیتے ہوئے حسب معمول صبح کے اخبار میں ضرورت ہے کا کالم پڑھنا شروع کیا۔۔۔ایک بڑی فرم میں ریسپشنسٹ کی جگہ خالی تھی۔

دوسری صبح سکول سے چھٹی لے کر وہ اس پتے پر ویسٹ وہارف کی ایک نئی عمارت پر پہنچیں۔تیسری فلور کی ایک اینگلو انڈین پاکستانی لڑکی نے ان سے پوچھا، یس پلیز۔۔۔؟

چھوٹی بٹیا نے نہایت گھبراتے ہوئے بیگ سے اخبار کا تراشہ نکالا۔۔۔

امیدواروں کا انٹرویو کون کرتا ہے۔۔؟

میجنگ ڈائریکٹر خود۔۔۔آپ کا ان سے اپوائنٹمنٹ ہے۔

نہیں ---------

درخواست مجھے دیجئے۔۔۔

درخواست تو میں نے لکھی ہی نہیں ---------

لڑکی کو چھوٹی بٹیا کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر ترس آ گیا ---------

آپ یہاں ٹھہریئے، میں بوس سے کہتی ہوں۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی، اور چھوٹی بٹیا اس کے ساتھ ساتھ ایک اورخنک اور جھل مل کرتی گیلری میں سے گزرتی ایک وسیع ایرکنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہوئیں، جس میں بہت بڑا سبز رنگ کا قالین بچھا تھا، اور ہلکی سبزی مائلسفید جھلملیوں والے طویل دریچے کے نیچے اور ایک طویل وعریض میز کے اس پار مینجنگ ڈائرکٹر گھومنے والی کرسی پر بیٹھا کاغذات پر دستخط کرنے میں مصروف تھا۔وہ سانولی رنگت کا خاصا خوش شکل آدمی تھا۔اس کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔آنکھوں میں سنجیدگی اور ایک نوع کی سوچ تھی۔دستخط کرنے کے بعد اس نے ڈکٹافون میں کچھ

کہا، اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اینگلو پاکستانی لڑکی چھوٹی بٹیا کو اندر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ وہ میز کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں۔ مگر مینجنگ ڈائرکٹر اسی طرح کاغذات میں منہمک رہا۔ (یہ اس کی خاص تکنیک تھی، تا کہ نووارد پر ظاہر ہو سکے کہ اس کا ایک منٹ کتنا قیمتی ہے)

فائل بند کرنے کے بعد اس نے سر اٹھایا

سلام علیکم، چھوٹی بٹیا نے کہا۔

سلام علیکم۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں،

آپ کے یہاں ایک جگہ خالی ہے،

جی ہاں، جی ہاں، تشریف رکھیے!، اس نے امیدوار کا ماہرانہ نظروں سے جائزہ لیا۔۔۔ لڑکی میں شدت کی سکس اپیل تھی۔ چھوٹا سا قد، بہت سفید رنگت، چھوٹی چھوٹی شربتی آنکھیں، سنہری مائل بال، بالکل جاپانی گڑیا ایسی، بالوں کی اس نے ایک خوب موٹی سی چٹیا گوندھ رکھی تھی، جو تراشیدہ بالوں کے مروجہ فیشن کے مقابلے میں بہت انوکھی، بہت ہی انوکھی اور بھلی معلوم ہوتی تھی۔

آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں، اس نے دل میں فوری فیصلہ کرتے ہوئے دریافت کیا،،

سلمیٰ مرزا----------

کوالیفیکیشن ----------

بی، اے، بی، ٹی۔۔۔

پہلے کبھی کام کیا ہے؟

جی نہیں----------جی ہاں----------ہمارا مطلب ہے ہم نے کبھی دفتر میں کام نہیں کیا، ہم سکول ٹیچر ہیں۔

مینجنگ ڈائرکٹر لڑکی کے اس ہم کہنے کے انداز پر زیر لب مسکرایا، پھر تھوڑے سے

وقفے کے بعد اس نے کہا۔

بہت خوب دیکھیے ۔ ہمارے یہاں صرف یہ کام ہے کہ یہاں دفتر میں آپ کا ہمارے غیر ملکی کلائنٹس کو رسیو کرنا ہوگا ۔ علاوہ ازیں جب کبھی میں غیر ملکی تاجروں، اعلیٰ افسروں وغیرہ کو میٹروپول یا جم خانہ وغیرہ مدعو کروں، تو ان کو انٹرٹین کرنے کے سلسلے میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں گی۔۔۔

مگر چھوٹی بٹیا نے کہنا چاہا۔۔

مینجنگ ڈائریکٹر نے ان کی ان سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔۔۔

آپ یقیناً آج کل کے مغربی طور طریقوں سے واقف ہوں گی ۔ اور ڈانس بھی کر سکتی ہونگی ۔ معاف کیجیئے گا یہ سوال میں اس لئے کر رہا ہوں، کہ پچھلے سال میں نے ایک پاکستانی لڑکی کا اسی کام پر تقرر کیا تھا، مگر وہ پارٹیوں میں بات کرتے ہوئے گھبراتی تھی، اور ٹیبل مینر سے بھی واقف نہیں تھی، تو میرا مطلب یہ ہے کہ آج کل اعلیٰ پیمانے کے کاروبار میں پبلک ریلشنز کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔

میں کسی یورپین لڑکی کو اس جگہ پر با آسانی رکھ سکتا ہوں، مگر آپ جانتی ہیں، آج کل یورپین اور امریکن حضرات مشرقی خواتین سے کس قدر متاثر ہیں۔

جی،، لیکن،، ہم،،

مینجنگ ڈائرکٹر فوراً بھانپ گیا کہ لڑکی یہ عہدہ قبول کرتے ہوئے جھجک رہی ہے ۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ ایسی غیر معمولی دل کشی اور سیکس اپیل کی مالک لڑکی اسے آسانی سے دستیاب نہ ہوگی ۔ اور اسے اپنا آئیڈیا ترسیل کرنا بھی خوب آتا ہے۔۔

وہ موضوع کی طرف لوٹا۔۔ مثال کے طور پر۔۔۔ یہ دیکھیئے کہ مغربی ممالک کی مشہور ایر لائینز اپنی ایر ہوسٹس لڑکیوں کو ساڑھیاں اور بلاؤز پہنا رہی ہیں ۔ محض اس لئے کہ مسافروں کو ----------

جی ---------- مگر ----------

نیو یارک کی اقوام متحدہ میں خود دیکھ کر آیا ہوں، جو گائیڈ لڑکیاں مشرقی ممالک کی ہیں، ان کے پیچھے سیاحوں کا جم غفیر چلتا ہے۔ یہ کوئی پریشان کن بات نہیں ہے، تو پھر طے ہے،، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ بڑی مکمل سیکرٹری ثابت ہوں گی۔ پہلی مارچ سے میں آپ کا تقرر کیے لیتا ہوں۔ آپ کی تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ہوگی۔

اس نے کن انکھیوں سے امیدوار لڑکی کا ردعمل دیکھا۔

دبیز پردوں میں سے سیاہ فام گوانی کلرک جن کی طرح نمودار ہوا،

مسٹر پیٹرک۔۔۔ آپ مس مرزا ہیں۔۔ ان کو میں اپنا سوشل سیکرٹری مقرر کر رہا ہوں۔ ان کا ذاتی فائل تیار کیجئے۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر ساڑھے سات سو روپے ماہوار پر اس کا تقرر ہو گیا۔ یہ بات چھوٹی بٹیا کو بڑی عجیب لگی۔۔

لیکن ہم سمجھتے تھے کہ یہ اشتہار آفس ریسشپنٹ کے لئے تھا، انہوں نے ایک بار پھر احتجاج کیا،

جی ہاں مگر آپ کو دیکھ کر میں نے اپنا خیال بدل دیا۔

مینجنگ ڈائریکٹر نے اپنی کرسی کا رخ گھمایا، اور لڑکی کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ کو دیکھ کر دل میں سوچا، بہت بھولی اور ذرا بیوقوف بھی ہے۔ اور بے حد ضرورت مند اور ناتجربہ کار تو یقیناً ہے۔۔۔

دوسری بات یہ ہے کہ۔۔۔ اس نے با آواز بلند کہا۔۔ کہ آپ رہتی کہاں ہیں۔۔؟

چھوٹی بٹیا نے اپنا پتا بتلایا۔

اوہ مینجنگ ڈائریکٹر کے منہ سے نکلا۔

چھوٹی بٹیا ساڑھی کا پلو سنبھال کر اٹھیں،

چھوٹی بٹیا نے لحظہ بھر کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔

بابا کے انتقال اور بھیا کے جیل چلے جانے پر وہ اسی طرح اشم پشتم ایک پرائیویٹ سکول میں پونے دوسو روپے ماہوار پر پڑھاتی رہی تھیں۔وہ ہر اتوار کو بھیا کے لئے اچھے اچھے پھل اور ان کے پسندیدہ سگرٹ اور نئی نئی کتابیں اور رسالے لے جانا چاہتی تھی۔مگر وہ اس تنخواہ میں ممکن نہ تھا۔

پھر بھیا یہاں سے کہیں بہت دور بھیج دیئے گئے تھے۔اور اسے بہاول پور کے ایک سکول میں سیکنڈ ہیڈ مسٹرس کی جگہ مل گئی تھی، کالونی کا مکان انہوں نے بہار سے آئے ہوئے ایک دو دھیالی رشتے دار کے حوالے کر دیا تھا، اور ماما کو ساتھ لے کر بہاول پور چلی گئی تھی۔وہاں زندگی کے پانچ مزید جھلسے ہوئے برس انہوں نے تپتے ہوئے ریگستان کے وسط میں ایک دور افتادہ، گمنام تحصیل میں لڑکیاں پڑھاتے گزارے تھے۔

وہاں ماما پر دل کے دورے پڑنے لگے تھے۔اس تحصیل میں ان کا علاج ناممکن تھا۔

اس لئے وہ ماما کو ساتھ لے کر پھر کراچی آ گئی تھیں۔پچھلے برس سے وہ پھر کالونی کے اسی مکان کے ایک کمرے میں رہ رہی تھیں، جس پر اب دو دھیالی رشتے داروں نے قبضہ کرلیا تھا۔اور اسی پرائیویٹ سکول میں پڑھا رہی تھیں۔اس ایک برس میں کلیم کے دفتر کے چکر لگاتے لگاتے ان کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے اور ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی دوڑ بھاگ میں بسوں اور سائیکل رکشاؤں پر اور پیدل شہر کی خاک چھانتے چھانتے اب ان میں سکت نہ رہی تھی،، مگر بھیا کا کبھی کبھار جو خط آتا تھا۔وہ اس میں کتنے پیارے الفاظ میں اس کی ہمت بندھاتے تھے۔۔۔اور پھر وہ سر اٹھا کے زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتیں۔وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔بابا کو مرے،، بھیا کو گھر سے نکلے کتنی مدت

گزر گئی تھی۔

۶۱ء آچکا تھا۔پچھلے پندرہ برسوں میں ایک دن، ایک رات ایسی نہ آتی تھی، جب وہ فکروں اور پریشانیوں اور غم والم سے ایک لمحے کے لئے آزاد ہوئی ہوں ۔ جب انہیں روزی کمانے کے لئے جی توڑ محنت نہ کرنا پڑی ہو ----------ساڑھے سات سو روپے ماہوار ----------ساڑھے سات سو روپے ماہوار----------نا قابل یقین----------اور دنیا کی لڑکیاں دفتروں میں کام کررہی تھیں ۔دفتر میں سکریٹری کا کام قطعاً کوئی گھٹیا کام نہیں تھا۔بھیا نے ان کو کتنی بار سمجھایا تھا۔

بٹیا تم دوسرے انسانوں سے قطعی مختلف نہیں ہو، اور پچھلے پندرہ سالوں میں اس نے بھیا پر ثابت کر دیا تھا، کہ وہ دنیا کے عام انسانوں سے مختلف نہیں تھی ۔اور بھیا کو ان پر کتنا بے پناہ فخر تھا ۔ ۔ ۔ میری بہادر بہن ----------میری سپاہی بہن ----------

انہوں نے فیصلہ کرلیا ۔ ۔ ۔

جی ہاں ----------

گڈ---------- پہلی تاریخ کو ہماری مائیکروبس صبح ساڑھے آٹھ بجے آپ کو پک کرنے آجائے گی ۔ ۔

دفعتاً چھوٹی بٹیا ایک بار پھر گھبرا گئیں ۔ ۔ ۔مگر ہمیں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ تو آتا ہی نہیں ----------

نیور مائنڈ ۔ ۔ ۔ ہمارے یہاں آدھ درجن ٹائپسٹ لڑکیاں موجود ہیں ۔ پہلی تاریخ،، ساڑھے آٹھ بجے،، خدا حافظ مس مرزا----------

گھر میں داخل ہوکر چھوٹی بٹیا نے پھولے ہوئے سانس سے آواز دی ۔ ۔ ۔ ۔

ماما ۔ ۔ ماما----------ہمیں ساڑھے سات سو کی نوکری مل گئی ----------اور آنے جانے کے لئے موٹر ۔ ۔ ۔

اچھا انہوں نے مختصر جواب دیا، انہوں نے کلکٹر صاحب کی موت کو برداشت کر لیا تھا۔ مگر سلمان کے جانے کے بعد سے انہیں چپ لگ گئی تھی۔۔

دہلیز پر اکڑوں بیٹھ کر لوٹے سے منہ پر چھپکے مارتے ہوئے اور اس کے بعد کھانا کھاتے ہوئے چھوٹی بٹیا سوچا کیں۔ مینجنگ ڈائریکٹر آدمی تو خاصا معقول نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد بوس اور سیکرٹری کے تعلقات کی مخصوص نوعیت اور اس کے متعلق لطیفے اور کہانیاں ان کے ذہن میں گھوم گئیں، لوگ ہمیں کیا سمجھیں گے، سستی، گھٹیا سیکرٹری، لوگ کیا کہیں گے، بیٹیا یہ تمہارا خیال ہے۔۔۔ لوگوں کو تمہاری اتنی پرواہ نہیں ہے ---------- انہیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں۔ انہیں بابا کے الفاظ یاد آ گئے۔ مگر یکم مارچ سے وہ اس مشتبہ ملازمت پر جانے والی تھی۔ انہوں نے فوراً ساڑھے سات سو کا تصور کیا ---------- ساڑھے سات سو روپے ماہوار یک مشت ۔۔فنٹاسٹک۔۔۔

اتنی بڑی رقم انہوں نے مدتوں سے نہ دیکھی تھی۔ انہوں نے اپنی پہلی تنخواہ کا بجٹ بنایا،، سب سے پہلے تو بھیا کے لئے ڈھیر ساری چیزیں خریدیں گے۔ سب سے پہلے ایک عمدہ سا شیونگ سیٹ،، بھیا کا شیونگ سیٹ اب تک کتنا خستہ حال ہو چکا ہوگا۔ نئے پاجامے اور قمیصیں بنوائیں گے۔ بہت سارے چاکلیٹ کے ڈبے اور سگرٹ کے ٹین لیں گے، بھیا نے پچھلی بار ایک کتاب کے لئے لکھا تھا۔ جو وہ پڑھنا چاہتے تھے۔ اور اس کی قیمت پچیس روپے تھی۔ اب ان کے لئے پچیس پچیس روپے کی کتابیں خریدنا کیا مشکل تھا۔۔ ہمارے پاس ساڑھیاں بالکل ختم ہو چکی ہیں، اس مہینے تو صرف سو روپے کی ساڑھیاں خریدیں گے۔ اور ایک جوڑا نئی سینڈلز سیاہ رنگ کی۔ جو ہر ساڑھی کے ساتھ چل جائے۔ اور مینجنگ ڈائریکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کی پارٹیوں میں جانا ہوگا۔ اس کے لئے تو بہت عمدہ ساڑھیاں خریدنا پڑیں گی۔ اور میک اپ کا سامان، خیر میک اپ تو میں نہ کرونگی۔ بھیا کو پوڈر لپ اسٹک والی

لڑکیوں سے کتنی نفرت ہے۔

اچھا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس آدمی نے ذرا بھی بدتمیزی کی تو ہم فوراً استعفیٰ دے دیں گے۔ یہ طے کر کے اس کو یک گونہ سکون ہوا۔ اور وہ کھانے کے برتن سمیٹ کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

سید اختر علی کا کمرہ جمشید کی کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا، جہاں وہ مسہری پر دن بھر چپ چاپ لیٹے رہتے۔ ان کی بیوی سینی ٹوریم سے صحت یاب ہو کر آ چکی تھیں۔ مگر ان سے شوہر کی ملاقات بہت کم ہوتی۔۔ سید اختر علی کو زندگی میں پہلی بار آرام وسکون نصیب ہوا تھا۔ وہ پیٹ بھر کے اچھے سے اچھا کھانا کھاتے، اور سوتے رہتے

۔

ایک ملازم محض ان کی خدمت پر مامور تھا۔ مکمل اطمینان اور سکون کی وجہ سے ان کی دماغی حالت رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی۔ اور جب ان کے دماغ نے دوبارہ باقاعدگی سے کام کرنا شروع کیا، تو وہ اس مسلسل بے کاری سے اکتا گئے۔

ابّا جمشید نے ان سے کہا، جس کا بیسیوں نارمل اور ابنارمل ہر طرح کے انسانوں سے سابقہ پڑتا تھا، اور جو اچھا خاصا ماہر نفسیات ہو چکا تھا۔

کمپنی لاء کی کتابوں پر ایک نظر ڈالا کیجئے۔ آپ کی قانون دانی میری فرم کے کام آئے گی۔ چنانچہ سید اختر علی بے حد ذوق وشوق سے قانون میں کھو گئے۔ تقریباً آٹھارہ سال بعد انہوں نے اپنے ایل، ایل، بی کے علم کو دوبارہ بروئے کار لانا شروع کیا۔ کبھی کبھی وہ جمشید کے دفتر بھی جانے لگے، اور اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ بیٹے کے کاروبار معاملات میں گھل مل گئے۔

ثریا کراچی پہنچ کر ناظم آباد میں ایک سہیلی کے ہاں اتری، جو چند برس پہلے ڈھاکہ کے سکول اسٹاف میں اس کے ساتھ رہ چکی تھی۔ اس نے دبی دبی زبان سے سلیمان کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ مگر جن لوگوں سے اس نے یہ استفسار کیا،

انہوں نے ذرا عجیب سی اور مشتبہ نظروں سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ چند روز بعد اسے پتا چلا کہ سلیمان کو کراچی سے بہت دور کسی نامعلوم مقام پر ایک نامعلوم مدت کے لئے منتقل کر دیا گیا۔ اس نے چھوٹی بٹیا کی تلاش شروع کی۔ سلیمان نے احتیاط کی وجہ سے اپنے خطوں میں کبھی چھوٹی بٹیا کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ نہ کبھی ان کا اتا پتا تحریر کیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں بٹیا جیسی گمنام اور مختصر ہستی کو ڈھونڈنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن ایک روز ثریا کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اب کراچی میں نہیں ہیں۔ اور کسی غیر معروف دور افتادہ مقام پر کسی سکول میں کام کر رہی ہیں۔ ثریا خاصی مشہور آرٹسٹ تھیں۔ اسے ایک گرلز کالج میں آرٹ کی لیکچرر مل گئی۔

اسٹاف کی چار پانچ لڑکیوں نے ناظم آباد اور پی، ای، سی، ایچ، ایس میں چار چار سو گز کے پلاٹ خرید لیے تھے۔ اور ان پر اپنے مکان بنوا رہی تھیں۔ انہوں نے ثریا سے اصرار کیا کہ کراچی میں مکان کرائے پر لے کر رہو گی، تو دیوالیہ نکل جائے گا۔ تم بھی قرضہ لے کر اپنا مکان تعمیر کروالو، ثریا نے سوسائٹی میں چار سو گز زمین قسطوں پر خریدی۔ مکان کی تعمیر کے لئے قرضہ لیا۔ اور چھ مہینے میں بیس ہزار کے صرفے سے اس کا خوبصورت کاٹج تیار ہو گیا۔ بوٹا بیگم نے اس کا باورچی خانہ اپنی مرضی کا بنوایا، چونکہ دونوں ماں بیٹیاں سمندر کے راستے مشرقی پاکستان سے آئی تھیں۔ بوٹا بیگم ڈھاکہ سے باورچی خانے کا رتی رتی سامان پتیلیاں، کڑچھے، ڈوئیاں، توا، چمٹا، سل بٹہ، ہاون دستہ ایک بڑی سی بوری میں بھر کر لیتی آئی تھیں۔ لیکن فرنیچر خریدنے کے لئے ثریا کے پاس پیسہ نہیں بچا تھا۔

وہ اپنی ساری تصویریں ڈھاکہ سے لے آئی تھی۔ مگر ابھی وہ اتنی بڑی آرٹسٹوں میں نہ تھی جن کی تصویریں دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں۔ یوں بھی کراچی میں پینٹنگز کے خریدار بھی زیادہ نہ تھے۔ اس نے ناظم آباد والی سہیلی سے ادھار لے کر دو سکینڈ ہینڈ کرسیاں، دو میزیں اور دو نواری پلنگ خریدے۔ غسل خانے کی چوکی، ایک

اسٹول بوٹا بیگم کے لئے نماز کا ایک چھوٹا سا تخت اور ایک پیڑھی ناظم آباد والی سہیلی نے اسے مستعار دے دیں تھیں۔

بوٹا بیگم بہت پہلے جب محمد گنج میں رہتی تھیں، تو ڈولی میں بیٹھ کر نکلتی تھیں۔قصر سلیمان میں بھی انہوں نے اپنا پردہ قائم رکھا۔کلکٹر صاحب سے ان کا کانا پردہ رہا۔

پرانے کٹرے کے مکان میں البتہ وہ ثریا کے تین چار دوستوں کے سامنے آ گئیں۔وہ سب انہیں بڑے پیار سے اماں اماں کہتے اور کرید کرید کر بے حد دل چسپی سے ان سے گاؤں اور گڑھی کے قصے سنا کرتے تھے۔

ڈھاکے آ کر بوٹا بیگم نے کبھی کبھی ساڑھی پہننا شروع کر دی، گو برقعہ ترک نہ کیا ،مگر کراچی میدان حشر تھا۔یہاں ان کا پردہ زیادہ عرصہ نہ چل سکتا تھا۔

کالج انہوں نے اپنی نگرانی میں بنوائی۔اس لئے ٹھیکدار اور راج مزدوروں کے سامنے آنا پڑتا۔اس کے بعد گھر جمانے کے لئے ساری بھاگ دوڑ انہوں نے خود کی ۔انہوں نے برقعہ اتارا، اور بسوں اور سائیکل رکشاؤں میں بیٹھ کر مختلف کاموں کے لئے سارے شہر کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔پروس کی کوٹھی کی یو، پی، والی بیبیوں سے ان کی ملاقات ہوگئی۔اب وہ بیگم حسین کہلاتیں، اور ساڑھی پہنے بڑی متانت سے آنچل سے سر ڈھکے، براؤن پلاسٹک کا بیگ اور گلابی پلاسٹک کا جالی دار تھیلا ہاتھ میں سنبھالے سائیکل رکشا پر بیٹھی بوری بازار جاتی نظر آتیں۔

ثریا دن بھر اپنی مصروفیتوں میں لگی رہتی، اور سلمان کو بھلائے رکھنے کی کوشش کرتیں۔رات کے سناٹے میں سلیمان کی یاد اور فکر اسے کھا جاتی۔مگر کتابوں، رسالوں، سیاست کی یاد سب سے زیادہ وابستہ تھی۔

ان دنوں اسے پیسے کی بہت سخت ضرورت تھی، تنخواہ کا زیادہ حصہ زمین اور مکان کے قرضے کی قسطوں میں کٹ جاتا تھا۔بوٹا بیگم کا دمے کا پرانا مرض عود کر آیا تھا۔اس کا علاج ہو رہا تھا۔اس کے پاس نئے کپڑے بھی نہیں تھے۔اور ڈھاکے میں خریدی

ہوئی ساڑھیوں سے کام چلا رہی تھی ۔وہ تصویر بناتے وقت بھی نناوے کے پھیر میں پڑی رہتی تھی۔

ایک روز وہ ڈھندار کمرے میں ایزل کے سامنے کھڑی اپنی تازہ تصویر مکمل کر رہی تھی ۔کہ باہر ایک چمکیلی شیورلے آن کر رکی ۔اور تنگ موریوں کے سلیکس میں ملبوس ایک بےحد اسمارٹ لڑکی اندر آئی ۔اس کے ساتھ دو امریکن خواتین تھیں ۔

میں عالیہ سید ہوں ۔لڑکی نے کہا۔ مجھے آپ کا پتہ آپ کے کالج سے معلوم ہوا ہے۔ یہ میری دوستیں کچھ پاکستانی پینٹنگز خریدنا چاہتی ہیں۔

نووارد وں نے چاروں طرف دیکھا،اور بیٹھنے کو کوئی چیز نہ ملی ،تو فرش پر گھٹنے ٹیک کر تصاویر دیکھنے لگیں ، ۔دونوں سیکنڈ ہینڈ کرسیاں پچھلے برآمدے میں رکھی تھیں ،ان پر بوٹا بیگم نے کپڑے دھو کر پھیلا دیئے تھے ۔اسٹول باورچی خانے میں تھا ۔ثریا کو اس وقت شدت کی کوفت ہوئی ۔تصویروں کے خریداروں کو بٹھانے کے لئے کمرے میں ایک صوفہ سیٹ اشد ضروری تھا۔

امریکن عورتوں نے تین تین سو روپوں میں سلہٹ کے دو مناظر فوراً خرید لیے۔ ثریا نے عالیہ سید کا شکریہ ادا کیا۔ عالیہ سید نے اسے اپنا ٹیلی فون نمبر دیا،اور اسے بتایا کہ اسے اتنی بڑی آرٹسٹ سے ملنے کا بہت شوق ہے ۔اور اسے اپنے گھر بھی مدعو کیا

۔

اسی روز ثریا نے شہر جا کر ایک صوفہ سیٹ ، ایک چھوٹا سا بک شیلف ، اور ایک ٹیبل لیمپ خریدا۔اور یہ سامان بڑے کمرے میں سجا کر سوچنے لگی کہ اگر ایک خوش رنگ سا قالین اور پردے بھی ہوں تو کمرہ جگمگا اٹھے۔

لیکن یہ فرنیچر خریدنے کے لئے اس نے پچاس روپے گھر کے خرچے میں سے بھی ڈال دیے تھے ۔اور ہر مہینے قرضہ بڑھتا جا رہا تھا۔

چند روز بعد اسے معلوم ہوا کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں آرٹسٹوں کو بہت

اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اسے عالیہ سید کا خیال آیا جو بہت بارسوخ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کالج سے اسے فون کیا۔

دوسرے سرے پر فون کا ریسیور عالیہ سید کے بھائی جمشید علی سید نے اٹھایا، اور جب اسے معلوم ہوا کہ مشہور فنکار ثریا حسین بات کر رہی ہیں، تو اس نے کہا

کمال ہو گیا! مجھ سے کل ہی عالیہ نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ میرے چند امریکن دوست بھی تصویریں خریدنا چاہتے ہیں، کسی روز آپ میرے ساتھ لنچ کھانا پسند کریں گی۔؟

چنانچہ اتوار کے روز ثریا حسین موٹر رکشا میں بیٹھ کر کراچی جم خانہ گئی۔

جمشید ٹینس کورٹ کے رخ والے بڑے کمرے میں اس کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر میں ٹینس کھیل کر عالیہ بھی آ گئی۔

باتوں باتوں میں عالیہ نے بڑے بے تکلف اور دوستانہ لہجے میں اس سے پوچھا

۔

ثریا تم تو ریڈ ہو نا؟

ثریا چونکی اور ذرا گھبرا کر اس نے کہا۔ نہیں تو۔۔ کیوں۔۔

اے کچھ نہیں ---------- میں نے سنا تھا۔۔۔

عالیہ نے بے پرواہی سے کہا۔۔۔

جمشید زور سے ہنسا۔۔ کالج کے زمانے میں رہی ہونگی،، لیکن ثریا کی گھبراہٹ دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا، ، مس حسین آپ کے لئے کسی بھی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں جگہ نکل سکتی ہے۔

اس کی فکر نہ کیجئے۔۔ اپنے خیالات اگر وہ اس قسم کے ہیں، تو ذرا ان کو میرا مطلب ہے۔ ان کا اظہار نہ کیجئے گا۔

علاوہ ازیں امریکن ٹورسٹ ہی ہمارے مصوروں کی تصاویر خریدتے ہیں، اور

بہت اچھے دام دیتے ہیں۔

میرا مطلب ہے، آپ کی تصاویر امریکنوں کے ہاتھ خوب، بک سکتی ہیں، اگر ان کو یہ خیال نہ ہو جائے، کہ آپ یعنی کہ ---------وہ کھوکھلی ہنسی۔۔۔ عالیہ کو کہیں اور جانا تھا۔ وہ ان دونوں کو لنچ کھاتا ہوا چھوڑ کر باہر چلی گئی۔

اگلے مہینے ثریا کی بنائی ہوئی کئی تصویریں عالیہ اور جمشید کے ذریعے بک گئیں۔ اس نے نشست کے کمرے کے لئے کھدر کے خوبصورت پردے خریدے جن پر موہن جوداڑو کے خوبصورت نقش و نگار بنے تھے۔ رنگین جوٹ کی بڑی سی آرٹسٹک سی چٹائی خریدی۔ اور ٹیلی فون لگوانے کی درخواست دے دی۔ اس کے آئندہ مہینے میں خود جمشید نے اپنے دفتر کے لئے ایک بڑی تصویر سات سو روپے میں خریدی، اور ایک اور تصویر کے لئے سیاح نے پورے ایک ہزار روپے دیئے۔ ثریا نے اس مرتبہ ایک چھوٹا سا فریج بھی خرید لیا۔ کھانے کے کمرے کا فرنیچر اور اپنی سنگھار میز اس نے کچھ عرصے بعد سنٹرل جیل سے بہت واجبی قیمت پر بنوالی، ٹیلی فون بھی لگ گیا، اور اب اس کا کالج منہ سے بولنے لگا، بڑے سے بڑا آدمی اس سے ملنے آجائے اسے کوفت نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اس کا خرچا بڑھتا جا رہا تھا، ٹیلی فون کا بل، بوٹا بیگم کے ڈاکٹر کا بل۔۔۔ دوکانوں کے بل۔۔ کالج جانے کے لئے اسے روزانہ ایک نئی ساڑھی چاہیئے تھی۔ وہ ایک ہی ساڑھی کلاس میں دو دن نہیں پہن سکتی تھی۔ اس کی طالبات ایک سے ایک فیشن ایبل تھیں۔ اس کا حلقہ احباب وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔

روزانہ شام کو کہیں نہ کہیں باہر جانا ہوتا تھا۔ اور یہاں کے فیشن ایبل ماحول کے مطابق معقول ساڑھیاں درکار تھیں۔

ڈھاکے میں تو چھ سات سوتی ساڑھیوں میں سارا سال گزر جاتا تھا۔ اور یوں بھی اب وہ ''ایک شخصیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور معمولی کپڑے پہن کر ادھر ادھر

نہ گھوم سکتی تھی ۔ اس کا معیار زندگی روز بروز اونچا اور مہنگا ہوتا گیا ۔ لیکن خوش قسمتی سے اسے ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں نوسو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی ۔ یہ ایجنسی جمشید کے کاروبار کی ساری پبلسٹی سنبھالتی تھی ۔ اس معقول مشاہرے کی وجہ سے ثریا کی بیشتر مالی الجھنیں ختم ہوگئیں ۔

اس ایجنسی میں اس نے سال بھر ہی کام کیا ہوگا کہ اسے ایک بے حد نفیس اور بیش قیمت اسکالرشپ پیش کیا گیا ۔ اس نے بوٹا بیگم کو اپنی سہیلی کے وہاں ناظم آباد منتقل کیا، کاٹج چار سو روپے ماہوار کرایہ پر اٹھایا، اور دو سال کے لئے پیرس چلی گئی ۔

مارچ ۶۱ء میں وہ کراچی واپس آئی اور لوٹتے ہوئے جرمنی سے اپنے لئے ایک فوکس ویگن بھی خریدی ۔

چھوٹی بٹیا کے تقرر کو ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ بوس نے بیچ لگژری میں ایک بہت بڑی پارٹی دی، اور اپنی سوشل سیکرٹری سے ڈکٹافون پر کہا، کہ وہ شام سات بجے تیار رہے ۔ وہ خود اسے آکر پک اپ کرلیں گے ۔

چھوٹی بٹیا نے پہلی تنخواہ ملنے پر الفنسٹن اسٹریٹ سے ایک انڈین ساڑھی اصل سے دوگنی قیمت پر خرید لی تھی، اور دفتر میں مس ڈی سوزا نے اصرار کیا تھا کہ کم از کم شام کے وقت میک اپ کرنا بہت لازمی ہے ۔ ۔ ۔ ورنہ چہرہ پھیکا پھیکا اور بے جان لگتا ہے ۔

چنانچہ چھوٹی بٹیا نے ایک ہلکے رنگ کا لپ اسٹک بھی خرید لیا تھا ۔

اندھیرا پڑ گیا تھا، اور وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی میک اپ کر رہی تھی ۔ وہ کھڑکی ہمیشہ بند رکھتی تھی ۔ کیونکہ اس میں سے گلی کا سامنا ہوتا تھا ۔ اس وقت انہوں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر آئینہ کھڑکی کی گرد آلود جالی میں اٹکا دیا تھا، اور پلنگ کے کنارے بیٹھی ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھیں ۔

چہرے پر فاونڈیشن کریم ملتے ملتے یک لخت ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ

گئے ۔انہیں دفعتاً یہ احساس ہوا کہ وہ پہلی دفعہ اپنی اس ڈیوٹی پر جا رہی ہیں ۔جس کے لئے اس کو ملازم رکھا گیا تھا ۔اسے بوس کے غیر ملکی دوستوں کو انٹرٹین کرنا تھا----------وہ اس پارٹی کی ہوسٹس تھیں،،اور انہیں لامحالہ بوس کی ڈمسٹرس بھی سمجھا جائے گا ۔۔اللہ میاں----------اللہ میاں----------ہم مر کیوں نہیں جاتے----------ہم----------انہوں نے نقاہت سے دیوار کا سہارا لیا۔

یا اللہ ہمیں موت کیوں نہیں آ جاتی---------

باہر ایک سرخ رنگ کی طویل کرائسلر آ کر رکی۔۔اور بڑا دبیز سا ہارن بجا۔۔

انہوں نے جلدی سے کھڑکی بند کی ۔لپ اسٹک لگایا،اور بیگ اٹھا کر دوسرے کمرے میں گئیں۔

ماما----------ماما،،ہم پارٹی میں جا رہے ہیں۔۔رات کو دس گیارہ بجے تک لوٹیں گے ۔

اچھا---------

برآمدے کے بالکل برابر کار کھڑی کر کے جمشید اسٹیرنگ پر بازو رکھے الہیٰ بخش کالونی کے اداس ماحول کو دیکھ رہا تھا،جسے جٹ پٹے کی تاریکی نے زیادہ الم ناک بنا دیا تھا۔

دنیا میں زیادہ تر انسان کس قدر بے رنگ زندگیاں گزارتے ہیں ۔اس نے سوچا

۔

اتنے میں مس مرزا باہر نکلیں ۔۔اس نے دروازہ کھولا----------اور اس کے برابر آ بیٹھیں۔

کرائسلر گلیوں کی دھول اور کیچڑ اور گڑھوں پر سے نہایت وقار کے ساتھ گزرتی باہر کی سڑک پر آ گئی۔

جمشید نے مڑ کر اپنی دل کش سیکرٹری کو دیکھا،اور مسکرا کر اخلاق سے دریافت کیا

سو، ہاؤ آر یو دس ایوننگ مس مرزا،،؟

فائن ---------- تھینک یو ----------

کاراب چوراہے کے بھیڑ بھڑ کے کو چیرتی ہوئی نکل رہی تھی ،لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دفتروں سے لوٹ رہے تھے ۔حلوائیوں اور چائے والوں کی دکانیں تیز نیون لائٹس سے چمک رہی تھیں ۔چھوٹے چھوٹے مکانوں کے برآمدوں پر جافریاں چڑھی تھیں ،اور ناموں کی چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی تھیں،ان سب ناموں کے پیچھے کتنی کہانیاں چھپی تھیں ۔دیواروں پر بڑے بڑے حروف میں ہومیو پیتھک ڈاکٹروں،، پانی بجلی ، اور بھاپ کے اصل جرمنی علاج اور پرائیویٹ کالجوں کے اشتہار لکھے ہوئے تھے ۔

جمشید نے ایک گہرا سانس لیا ،اور پھر پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی پر نظر ڈالی ۔وہ اپنے اسٹاف کے دکھ سکھ میں ذاتی دل چسپی لیتا تھا۔۔۔اور ان سے بڑی دردمندی سے پیش آتا تھا۔۔۔

آپ کو دفتر کا کام کیسا لگ رہا ہے،مس مرزا،

،،اٹس آل رائٹ ---------- جواب ملا،،

اب کراسلر سنٹرل جیل کی دیوار کے نیچے سے گزر رہی تھی ۔دفعتاً جمشید نے دیکھا کہ اس کی سیکرٹری کا رنگ پیلا پڑ گیا ،اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میچ کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہے ۔

مس مرزا---------- مس مرزا ---------- کیا بات ہے ----------اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔۔۔

،،کچھ نہیں ۔۔چھوٹی بٹیا نے گھبرا کر منہ دوسری طرف کر لیا----------

کیا ہوا----------بتلایئے تو----------

،، کچھ بھی تو نہیں ---------

وہ خاموش ہو گیا ۔ ۔ بہت شریف لڑکی ہے --------- مگر بے حد نروس طبیعت کی مالک ہے --------- خیر ٹھیک ہو جائے گی ،،

کہ آپ نے پارٹی اینجوائے کی --------- آج میں نے پہلی مرتبہ آپ کو دیکھا ہے ---------اور آپ نے شیری چکھنے میں اتنا تکلف کیوں کیا؟ ،، پڑھی لکھی لڑکی ہو کر اتنی دقیانوسیت ! ،، خوش رہیئے ---------زندگی سے جی بھر کر محظوظ ہو جیئے ،، ہم لوگ اس دنیا میں بار بار پیدا نہ ہونگے ۔ ۔ ہنسئے ،، ہنسئے ---------ڈیم اٹ --------- میں نے بہت آپ جناب کر لیا---------تم میری سیکرٹری ہو، میں تمہیں صرف سلمیٰ کہوں گا ،، اپنا یہ سکول مسٹرس کا ڈینی لبادہ اتار دو، اگر یہ اولڈ میڈ والی ذہنیت اختیار رکھی تو واقعی ہی ساری عمر اولڈ میڈ ہی رہو گی ،، اور یہ بڑی سخت ٹریجڈی ہو گی، جوانی کی مسرتوں کا تم پر بہت زیادہ حق ہے ۔

جمشید کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی ،،

رات کو جمشید علی گھر پہنچا تو شراب کے مدھم سرور کی لہروں پر تیرتا ہوا سوچ رہا تھا ، گو اس لڑکی کے خاندان کا کچھ پتہ نشان معلوم نہیں ، مگر ہے بڑی پیاری سی ---------اور انگریزی بالکل میموں والی بولتی ہے ،، ممکن ہے اس کی ماں انگریز ہی ہو ---------بہترین بیوی ثابت ہو گی ،،

اگر آپ پارٹی میں بھی اس طرح چپ رہیں ، تو میری بزنس ہو چکی ----------

کچھ دیر بعد جمشید نے ذرا خوش دلی کی سعی کرتے ہوئے کہا---------

وہ دل پر جبر کر کے اخلاقاً ہنسی، جمشید نے سگرٹ جلایا ۔ ۔ ۔

آپ اسموک نہیں کرتیں---------

جی نہیں ---------

اس لڑکی کے بے بس سے وقار نے اسے اتنا مرعوب کر دیا کہ مزید ذاتی سوال کرنے کی اسے ہمت نہ پڑی، اور اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

پارٹی کے اختتام پر جمشید اپنی سیکرٹری کے قریب آیا، اور بڑی گرم جوشی اور طمانیت سے اس کا چھوٹا سا سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا----------

مس مرزا آپ تو فرنچ بولنا بھی جانتی ہیں،، چھپی رستم نکلیں آپ تو،، آپ نے اتنی خوبصورتی سے میزبانی کے فرائض انجام دیئے ----------

یہ لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر اس ملک میں اتنی چارمنگ اور پرفیکٹ سیکٹریاں ہوتی ہیں، تو ہم اپنا سارا کاروبار یہاں منتقل کرنے کو تیار ہیں----------

اب ہمیں گھر پہنچا دیجیئے ----------

یقیناً---------- لیکن مس مرزا۔۔ آپ عموماً اس قدر کاموش رہتی ہیں، اور آج شام اتنی ڈیپریسڈ معلوم ہو رہی تھیں، کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی----------خاموش طبیعت، محنتی، اور خوش اخلاق، مگر رہتی ہے کالونی میں اسٹیٹس کا بڑا پرابلم ہے۔۔۔ وہ بارات لے کر کالونی کس طرح جائے گا----------

لیکن کپڑے تبدیل کر کے پلنگ پر لیٹتے وقت جب اس کا سر ذرا سا زائل ہوا، تو اس نے سوچا،، لاحول ولاقوۃ'' یہ میں کیا بکواس سوچ رہا تھا---------- کیسی شادی ، ، کس کی شادی ، ، میں اس لونڈیا کو Groom کروں گا CONTACT WNMAN----------ثابت ہوگی، ایک سے ایک بڑا گھاگ اس کی صورت پر ریشہ خطمی ہ وکر سارے کارو باری راز اگل دے گا----------لاکھوں کے معاملات منٹوں میں طے ہو جائیں گے ----------

اس نے پلنگ پر لیٹ کر ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور سگرٹ جلایا،،

what a lecky dog !AM WHAT A LUCKY DOG! اس نے دل میں کہا،،

ریا کار، اور جعل ساز اس نے خود بنایا تھا۔

O,WHAT DOG I AM,WHAT A DOG ,WHAT A DOG, اس نے زور سر تکیہ پر مکہ مارا، اور کمبل میں منہ چھپا کر سو گیا۔

منصور احمد ثریا سے پیرس میں ملا تھا، وہ ایک ہونہار، محنتی اور بے حد ذہین جرنلسٹ تھا۔ اور کئی سال امریکہ میں پبلک ریلیشنز کی تکنیک سیکھنے کے بعد حال ہی میں کراچی واپس آیا تھا، اور ان دنوں ایک انگریزی روزنامے سے منسلک تھا۔ اور شہر کے کامیاب اور با اثر صحافیوں میں اس کا شمار کیا جا رہا تھا۔

اس وقت وہ پریس کلب میں بیٹھا، ثریا کی ہونے والی نمائش کے متعلق ایک رائٹ اپ لکھ رہا تھا، ثریا نے پریس کلب کو اپنی ایک بڑی پینٹنگ تحفے میں دی تھی۔ اور منصور نے اسے فون کیا تھا کہ وہ اپنی پینٹنگز کو اپنی مرضی کے مطابق دیوار پر آویزاں کرے، اور کھانا بھی وہیں کھائے۔

اتوار کی سہ پہر تھی، تین چار صحافی ہال کے ایک کونے میں بڑی سنجیدگی سے شطرنج میں غلطاں و پیچاں تھے۔ منصور نے مضمون شروع کرنے کے لئے کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا، کہ دفعتاً اسے یاد آیا کہ اسے اپنے اخبار کے لئے بھارت کے متعلق ایک اہم مضمون تیار کر کے جلد از جلد کاپی فائل کرنی ہے۔ وہ فوراً لمبی میز کی طرف گیا، جہاں رسالے اور اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے سرعت سے بھارت کے سیاسی کوائف کا جائزہ لینے کے لئے اس نے اتر پردیش کا ایک غیر معروف سا اخبار اٹھایا۔ اس میں زیادہ تر ملک کے مختلف حصوں میں ہونے والے عرسوں کی اطلاعات اور صوبے کے اسلامی اور عربی مدارس اور اوقاف کے انتظامات کے متعلق خبریں درج تھیں۔

اضلاع کی خبروں کے کالم میں ایک چھوٹی سی سرخی تھی،

''شاہ منور علی کا وصال''

موضع محمد گنج سلطان پور (اودھ) کی درگاہ شریف کے سجادہ نشین مخدوم زادہ شاہ منور علی، نور مرقدہٗ ہندوستان جنت نشان، کی پاک سرزمین (پاک سرزمین) منصور احمد نے دل میں کہا، پاک سرزمین صرف پاکستان کی ہے۔، کہ ان کے عارفین کاملین اور بزرگان گرامی میں سے تھے۔ جو ---------منصور احمد نے اکتا کر آگے نظریں دوڑائیں، اسی کالم میں ایک اور غیر دل چسپ سی خبر تھی۔ جناب نوروز حسین آف پاربتی (ضلع سلطان پور نے جو ودھان سبھا میں سوتنتر پارٹی کے ممبر ہیں کل،،

منصور احمد نے اور آگے پڑھا، جہاں وزراء نکتہ چینی، بلیک مارکیٹ، رشوت ستانی، ذات بندی، صوبہ پرستی، فرقہ پرستی، کے انسداد کے مطالبے اور دیگر معاملات کے کوائف چھپے ہوئے تھے۔

ایک سرخی پر اس کی نظر ٹھہر گئی ---------جو اہم ہو سکتی تھی۔

کامریڈ آنند موہن گھوش کا لوک سبھا میں سوال ۔۔نئی دہلی ۱۲ مئی ۔۔۔لوک سبھا میں بحث کے دوران کیمونسٹ ممبر کامریڈ آنند موہن گھوش نے

یہ کیا ہو رہا ہے ---------ثریا نے پیچھے سے آن کر آواز دی۔۔

ہیلو ---------ثریا--------- منصور نے اخبار بند کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔۔

معاف کرنا مجھے دیر ہو گئی۔ ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا---------اس کے ساتھ عابد انصاری بھی تھا جو منصور کے مخالف اخبار میں چیف رپورٹر تھا۔ اور ان دونوں میں بہت دوستی تھی۔ مگر خبروں کی اسکوپ کے معاملے میں دونوں ایک دوسرے کو چوٹ دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ ---------میں عابد کو اپنی میورل دکھانے لے گئی تھی۔ اس میں ایک گھنٹہ لگ گیا، ثریا نے کہا،

۔۔جو تم ایرپورٹ پر بنا رہی ہو، منصور احمد نے دریافت کیا---------

نہیں جمشید ہاؤس کی لاؤنج میں ---------ثریا نے کہا---------

''جمشید ہاؤس؟،، اچھا، وہ جمشید سید کی نئی کوٹھی،،

اس کے لئے بہت سے آرٹسٹ دانت لگائے بیٹھے تھے۔

کیونکہ جمشید علی پیسے بہت فراخدلی سے دیتا ہے۔

عابد انصاری نے کہا۔۔

میں فوٹو گرافر لے چلوں،؟ میورل کے ساتھ تمہاری تصویر بھی چھپ جائے گی،

منصور احمد نے کہا---------

ابھی رہنے دو، ابھی اس میں ہاتھی کی سونڈ باقی ہے،

ثریا نے جواب دیا۔

ہاؤس وارمنگ کے روز دیکھ لینا۔

اچھا تو تم نے اس میں بھی مشرقی پاکستان کا موٹیف رکھا ہے، منصور احمد نے جھک کر کہا، اور کاغذ پر ایک جملے کا اضافہ کیا، پھر اس نے کہا، ثریا تم کو ماننا پڑے گا۔ کہ اس موضوع کے لئے اس سے بڑھ کر پبلسٹی نہیں ہوسکتی، ایک مضمون میں اپنے نام سے لکھ رہا ہوں۔ چار رمضان میں اگلے ہفتے تک مختلف ناموں سے پریس میں اور آجائیں گے۔۔ اور تمہاری نمائش کا کتابچہ بہت خوبصورت چھپا ہے۔

تھینکس ---------ہاؤسویٹ آف یو،،

تم جا کر کھانا منگواؤ، میں ابھی ایک ضروری نوٹ لکھ کر آتا ہوں۔

جلدی کرنا ثریا نے کھانے کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا،

منصور احمد نے نہایت سرعت سے بھارت پر نوٹ مکمل کیا، اور ٹائپ رائٹر پر دوسرا کاغذ چڑھایا، اور تیزی سے ٹائپ کرنا شروع کیا---------

کراچی کے فنی حلقوں کے لئے مس ثریا حسین محتاج تعارف نہیں ہیں۔۔۔

مس حسین نے جو اتر پردیش (بھارت) کے ایک تعلقہ دار کی صاحب زادی ہیں۔ مسوری کانونٹ میں تعلیم حاصل کی، اور اس کے بعد شانتی نکیتن،

(۳)

پی، ای، سی، ایچ کی ایک اونچی نیچی پتھریلی سڑک پر بے شمار موٹریں کھڑی تھیں ۔اور معزز مہمان اتر اتر کر اندر جا رہے تھے، کراچی کے مشہور بزنس مین جمشید علی سید نے اپنی نئی کوٹھی کی ''ہاؤس وارمنگ'' کی دعوت میں شہر کے تقریباً سبھی اہم لوگوں کو مدعو کیا تھا، کوٹھی کے لاؤنج کے طویل دریچے میں سے وسیع اور سرسبز لان کا منظر ایک ٹیکنی کلر سینما اسکوپ پردے کی مانند دکھلائی دے رہا تھا۔ درختوں میں جگمگاتی روشنیاں قندیلیں، کیاریوں کے خوب صورت پھول، گھاس پر بکھرے ہوئے صوفے، اشیائے خورد ونوش سے لدی ہوئی میزوں کی قطاریں قیمتی سگرٹوں کے ڈبے، سفارت خانوں کے افراد، نظر فریب ہندوستانی ساڑھیاں پہنے دل فریب پاکستانی بیگمات ----------سرسراتے ہوئے ایوننگ گاؤن اور کاک ٹیل ڈریس، عطر کی لپٹیں،

برف کی بالٹیوں میں ڈوبی ہوئیشراب کی بوتلیں ادھر ادھر کھڑے ہوئے جرنلسٹوں کے گروہ کیمرہ سنبھالے، چاروں طرف ٹہلتے ہوئے فوٹو گرافر، وقتاً فوقتاً کوندتے ہوئے فلیش بلب، بڑے بڑے کاروباری جغادری مل اونر، اعلیٰ سرکاری عہدے دار کابینہ کے وزیر، سفیر اور فرسٹ سیکرٹری اور پریس اتاشی اور کمرشل اتاشی۔ چبوترے پر ڈانس بینڈ بج رہا تھا۔ اور چند جوڑے رقص میں مصروف تھے۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ کوٹھی کی دوسری منزل پر روک اینڈ رول کا شور مچ رہا تھا، اور فیری اپنے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اودھم مچا رہی تھی۔ نیچے لان پر عالیہ سید نہایت بیش قیمت سفید رنگ کی بنارسی ساڑھی میں ملبوس، گلے میں سچے موتیوں کی ایک لڑی پہنے ہوئے میزبانی کے فرائض انجام دینے میں مصروف تھی۔ اختر علی سوٹ پہنے ایک کونے میں سگار پینے میں مشغول تھے۔ جمشید کے دونوں بھائی

امریکہ پلٹ کم عمر لڑکیوں کے ایک گروہ میں کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔

لاؤنج کے اندر چند مہمان دیوار کی سطح پر بنے ہوئے فریسکو پر رائے زنی میں منہمک تھے۔ثریا جس نے فرانسیسی شیفون کے بڑے بڑے سرخ پھولوں والی ساڑھی پہن رکھی تھی۔تصویر کے سرے پر کھڑی مداحوں سے باتیں کر رہی تھی۔اس کے بال تازہ ترین بی ہائیو اسٹائل میں بنے تھے۔اور اس نے شنیل فائیو کی خوشبو لگا رکھی تھی۔اور اس کے بلاؤز کی تراش میں سے اس کی ساری پیٹھ عریاں تھی۔

مس حسین میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب آپ جیمنی رائے کے اثر سے آزاد ہو چکی ہیں۔۔آپ کے بنائے ہوئے نقوش اور رنگوں میں اب قومی کردار اور قومی طرز کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔

۔۔۔پاکستانی آرٹ کے ایک مشہور نقاد نے اس سے کہا۔۔

پاکستانی آرٹ کا مستقبل اب ہمارے فن کاروں کی نئی نسل کے ہاتھ میں ہے۔آپ کے پیرس پیریڈ کی تصاویر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ اپنے تہذیبی ورثے کی طرف آ رہی ہیں۔دوسرے نے کہا۔۔

یہ مثال کے طور پر موسیو ویز لیے آپ ہاتھی کی سونڈ ملاحظہ کیجیئے۔فریسکو کے سامنے ایک اور انٹیکچوئل نے ایک موٹے فرانسیسی کو مخاطب کیا۔

ہاتھی ---------اس نے حلق صاف کر کے مقررانہ انداز میں بات جاری رکھی ۔۔۔مشرقی پاکستان کی کلچر کا ایک سمبل ہے،وہاں ندیاں،بوٹ مین ہاتھی اور مچھلیاں۔۔۔

''مچھلیاں،کشتیاں،اور جوٹ۔۔۔دوسرے انٹکچوئل نے اضافہ کیا۔

موٹے فرانسیسی نے جو شکل سے ذرا احمق سا معلوم ہوتا تھا،عینک ناک کی پھننگ پر اچھی طرح جمائی اور آنکھیں پھاڑ کر تصویر کو دیکھا۔۔ایسے ہاتھی تو انڈیا میں بھی ہوتے ہیں۔اس نے حیرت سے کہا۔

مس حسین، پہلے انٹیلکچوئل نے کہا موسیو ویڑے کو اپنے شاہکار کی سمبلزم سمجھائیے، پاکستان---------روایت کی جڑوں کی تلاش اور مسلمانوں کے اجتماعی فنی لاشعور کے مظاہر کی معنی آفرینی اور---------

بیرا شراب کی بوتلیں اور جام ایک ٹرے میں رکھے ادھر آیا، وہ سب جام ہاتھوں میں لے کر فریسکو کے سامنے کھڑے آرٹ پر تبادلہ خیالات میں مصروف تھے۔

دیوار کی سبز روغنی سطح پر آم کے درخت بے ترتیبی سے آڑے ترچھے کھڑے تھے۔عقب میں ایک گہری ندی بہہ رہی تھی۔۔سامنے سے ایک ہاتھی گزر رہا تھا، جس پر زرد رنگ کی جھول اور چوکور سا ہودہ تھا۔اس میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔۔پوری تصویر بنگال فوک آرٹ کی طرز میں بنائی گئی تھی۔

ثریا---------دوسری طرف سے کسی نے آواز دی---------تمہیں جمشید ڈھونڈتا پھرتا ہے۔۔۔

وہ لاؤنج میں جمع مہمانوں سے معذرت چاہ کر باہر لان میں گئی۔مقابل کی روش پر اس نے ایک سنہرے بالوں والی پستہ قد لڑکی کو آتے دیکھا۔اس لڑکی نے جھل مل کرتے ستاروں والی آتشیں گلابی ساڑھی پہن رکھی تھی اور بالوں کا بہت اونچا پھیلے ہوئے تاج یا پنکھے کا سا جوڑا بنائے تھی۔۔۔جس کی اونچائی کی وجہ سے اس کے قد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا---------

پپوٹوں کے ہلکے نیلے روغن اور ہونٹوں کے گہرے گلابی رنگ کے ساتھ اس کا میک اپ بے حد نفیس اور مکمل تھا، وہ لڑکی قریب آ گئی۔۔۔

وہ دونوں آمنے سامنے اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئیں،، کئی سیکنڈ گزر گئے، وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔۔۔

چھوٹی بٹیا۔؟

وہ خاموش رہی۔

چھوٹی بٹیا۔۔آپ۔۔میں۔۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا---------

''او ہیلو ثریا۔۔کسی مہمان نے قریب آ کر گرم جوشی سے کہاLONG TIME TO SEE--------- تمہیں فون کرتے کرتے عاجز آ گیا۔ویسے تم رہتی کہاں ہو؟

ہاؤسنگ سوسائٹی۔۔ثریا نے اس آواز میں کہا جو اس نے خود بھی نہیں سنی۔پھر اس نے جواب دہرایا،،ہاؤسنگ سوسائٹی''

اچھا میں کل شام کو عالیہ کے ساتھ آؤں گا۔وہ مجمع میں غائب ہو گیا۔۔

پیچھے سے جمشید نے آ کر ثریا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، اس کے ایک ہاتھ میں کاک ٹیل کا گلاس تھا۔

جان من ----------اس نے ذرا لہک کر کہا----------ڈھونڈ تھکا ہوں----------

بن کے بن چھان پھرا گلی گلی، کہاں تھیں، ارے تم دونوں ایسے چپ چاپ کیوں کھڑی ہو!،، کیا تمہارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں؟

ثریا دس از سلمٰی مرزا---------مائی موسٹ ایفی شنٹ سوشل پرسنل اینڈ کانفی ڈنشل سیکرٹری۔۔۔چلو جان من ناچیں۔۔۔

اس نے گلاس تپائی پر رکھا، اور ثریا کو کھینچتا ہوا چبوترے پر لے گیا۔۔وہاں دونوں رقصاں جوڑوں کے بھنور میں غائب ہو گئے۔

ڈانس بینڈ کی دھن تیز ہو گئی، سلمٰی قریب کے صوفے پر بیٹھ گئی، اس کا دل بہت گہرے اندھیرے سمندر میں ڈوب چکا تھا،، صوفے پر ٹک کر وہ ثریا کو جمشید کے ساتھ ناچتا دیکھتی رہی،،

ثریا باجی،، اس نے دل میں کہا، بھیا آپ کے نام کی مالا جپتے جپتے برسوں کی قید

کاٹنے چلے گئے----------جب وہ قید تنہائی کی لمبی مدت کے بعد باہر نکلیں گے، ان کے بال سفید ہونگے ،وہ بوڑھے ہو چکے ہونگے ۔لیکن میرے بھیا کبھی بوڑھے نہ ہونگے۔۔۔کبھی نا امید نہ ہونگے ،کبھی ہار نہ مانیں گے،،

جب کہ ثریا باجی آپ نے اتنی آسانی سے ہار مان لی---------- آپ جنہوں نے بھیا کو روشنی دی تھی ،،دل دیا تھا،، ہمت دی تھی ۔۔اس نے آنکھیں میچ لیں، تا کہ پارٹی کے کسی منظر کو نہ دیکھ سکے،

ہیلو۔۔۔!کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔۔وہ چونکی۔۔۔ سامنے کپاس کے ملک التجار مسٹر زادوپری کھڑے اپنے نقلی دانت نکوس رہے تھے ۔ ان دنوں سلمٰی کی ڈیوٹی تھی کہ ان کو انٹرٹین کرے----------ارے تم ادھر پاگل مافک---------- کائے کو بیٹھا----------ڈانس نہیں کروگی۔۔۔

جی نہیں ، میں اس وقت ڈانس نہیں کرونگی ۔۔سلمٰی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا----------اس وقت مجھے معاف کیجئے ۔۔

ارے،ارے،ہم کو بولو---------- کیا بات ہے۔طبیعت کھراب ہے تمہارا۔ ؟

مسٹر زادویری نے اس بے تکلف لہجے میں دریافت کیا،جس طرح لوگ اپنی بیویوں سے بات کرتے ہیں---------- سلمٰی لرز اٹھی،

اچھا چلو،ادھر ٹیبل پر تمہارا اکھا فرینڈ لوگ ڈیٹ کرتا،وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے اٹھی۔۔

’’ثریا باجی میں آپ سے کس بات کا شکوہ کر سکتی ہوں، میں خود ہار مان چکی ہوں----------

وہ مسٹر زادویری کے ہمراہ میزوں کی طرف چلی گئی----------جہاں بوفے شروع ہو چکا تھا----------

رقص کے بعد جب ثریا چبوترے سے اتر کر لان میں آئی تو اس نے سلمیٰ کو مسٹر زاویری کے ساتھ صوفے پر بیٹھے دیکھا، وہ جس انداز سے سلمیٰ کو گھور رہے تھے، ان کے چہرے پر ثریا کو درگاہ کنڈ کے نواب سکندر قلی خاں عرف بھورے نواب کی آنکھیں نظر آئیں،

دفعتاً ایک بھیانک دھماکہ ہوا، اور سامنے کے اس رنگین اسکوپ نظارے کے پرخچے اڑ گئے----------سیاہ دھواں اور سرخ شرارے ساری فضا میں رقصاں تھے، بہت دور ایک مہیب جوالا مکھی نے آگ اگلنا شروع کی۔ گرم گرم دہکتا ہوا لاوا بہتا ہوا سارے میں پھیل گیا۔ آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ، زلزلے کے دھماکوں آرکسٹرا کے سروں راک اینڈ رول کے شور، قہقہوں اور گلاسوں کی کھنکھاہٹ میں سے گزرتی ہوئی ایک مدہم اداس۔ خوبصورت آواز ثریا کے کانوں میں گونجی----------

ماضی کی محل سرائیں جل کر خاک ہوئیں مگر ابھی ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے۔ کل کے جاگیرداروں کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا، کل کا بیجا گیرداروں کی جگہ آج کا سرمایہ دار،

ثریا نے سہم کر آنکھیں بند کرلیں، یہ بلجین کٹ گلاسوں کے فانوس سے جگمگاتا ہوا اطالوی کا بنایا ہوا، الٹرا ماڈرن جمشید ہاؤس نہیں تھا۔

یہ سلطان پورہ کے تعلقے دار درگاہ کنڈھ کی نیم تاریک گڑھی تھی، جس میں خود بسنتی بیگم قید تھی۔۔ پھر درگاہ کنڈ کی جمشید ہاؤس میں تبدیل ہوگئی، اس میں چھوٹی بٹیا قید تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر پہچاننے کی کوشش کی۔ سامنے ہری گھاس پر کون لوگ ٹہل رہے تھے۔ مسٹر زاویری، مسٹر گھاسٹ والا، اور مسٹر برٹن میں تبدیل ہو گئے۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔۔ سامنے جمشید کھڑا تھا۔۔

جان من۔۔ اس نے سرور کے عالم میں کہا۔۔

اس جام جمشید کا جام تو پی لو،، جس کا نام جمشید ہاؤس ہے۔۔ یہ میرا جام جہاں

سارے دروازے اندر سے بند کر دیئے۔

ثریا نے ڈرائی مارٹینی کا جام تپائی پر رکھا، اور آنکھیں نیم وا کر کے سلمیٰ پر نظر ڈالی

۔

ہیوا ے ڈرنک سلمیٰ ڈیر۔ اس نے کہا،

مسٹر پیٹرک نے شیری سے جام بھر کر سلمیٰ کو دیا، وہ ثریا کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی

۔

ہاتھا پائی کرتے ہوئے معزز مہمانوں نے تین چار سرخوشی کے نعرے بلند کیے۔ لیکن سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی پر جنون سوار تھا۔ انھوں نے جمشید بھائی کو پیٹ بھر کر گھونسے مارے، جمشید قالین پر گر پڑا۔ کئی گلاس چھناکے سے ٹوٹے، جمشید کے چہرے اور ہتھیلیوں پر کرچیں چبھ گئیں، اور خون نکل آیا، ثریا اور سلمیٰ اطمینان سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہیں۔

باہر چبوترے پر تقریباً سارے مہمان کسی تازہ ترین تیز رفتار جنوبی امریکن رقص میں مصروف تھے۔ اور ڈانس بینڈ کے ڈرم زور زور سے بج رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دھن تبدیل ہوئی، اور ڈانس بینڈ نے افریقہ کے تاریک جنگلوں کی ایک تیز و تند وحشی تال ڈرم پر بجانا شروع کی، اور رقصاں جوڑے تالیاں بجا بجا کر فرش پر زور زور سے پیر پٹخنے، افریقی تال پر تیز تیز چکر کاٹنے، اور اچھلنے کودنے لگے۔

اندر ڈرائنگ روم میں سیٹھ عیسیٰ بھائی ہنکارا کیئے ۔ ۔ ۔ ۔ جھوٹا بے ایمان ----------سالا----------چور ----------مسٹر پیٹرک نے ان کا نشہ اتارنے کے لئے پانی کا پورا جگ ان کے سر پر انڈیل دیا۔

سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی فرش پر لمبے لمبے لیٹ کر ایک ہی سانس میں دہرانے لگے ----------

اکھا پانچ لاکھ روپیہ ----------پانچ لاکھ ----------پانچ لاکھ روپیہ مسٹر

پیٹر نے بقیہ حضرات کے لئے تازہ گلاس بھرے ،، دفعتاً سیٹھ عیسیٰ بھائی اٹھے ، اور چالاک بلی کی سی تیزی کے ساتھ جھپٹ کر جمشید کو پھر دبوچ لیا۔

چور۔۔۔وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دھاڑے ''ثریا باجی ،، ثریا باجی ،، مسٹر گھاسٹ والا نے چور پکڑا ہے۔سلمیٰ نے سرخوشی کے عالم میں کہا، اور نازک سا قہقہہ لگایا----------

جمشید سیٹھ بھائی کی گرفت سے چھٹ کر پھر فرش پر گر گیا، کچھ دیر کے لئے مکمل سناٹا چھا گیا، مسٹر زاویری سیٹھ گھاسیٹ والا کو کمرے سے باہر لے گئے۔

جمشید کہنیوں کے بل قالین سے اٹھا، رومال سے چہرے اور ہاتھوں کا خون صاف کیا، پھر وہ چاروں پیر کتے کی طرح چلتا ہوا دونوں لڑکیوں کی طرف آیا۔۔۔ ۔وہ بری طرح سسکیاں بھر کر رو رہا تھا۔وہ کھڑا ہو گیا، اور سلمیٰ پر جھک کر بولا،

ہم چور نہیں ہیں ۔۔ثریا اس کو بتا دو ----------ہم چور نہیں ہیں، اس کو بتا دو جمشید اچور نہیں ہے۔

یو آر میرلی ویری ڈرنک مسٹر جمشید ( YOU ARE MERELY VERY DRuNKمسٹر جمشید ---------- سلمیٰ نے بے زاری سے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔۔

یکا یک وہ گانے لگا----------

اگیا لاگی سندر بن جل گیورے،،

ثریا نے ایک لمبا سانس لیا، اور صوفے سے اٹھی، اور سلمیٰ کی مدد سے لے جا کر اسے بڑے صوفے پر لٹا دیا۔

باقی ماندہ مہمان بھی بار سے اٹھ کر جا چکے تھے۔

مسٹر پیٹرک نے جھاڑن سے بار کی تر بتر سطح کا پونچھا ، اور باہر چلا گیا----------

جمشید نے صوفے پر پڑے پڑے ایک اور بہت پرانا تھیٹر کا گیت شروع کر دیا۔

میں آفت کا پرکالا ہوں۔

ناچ نچادوں دم بھر میں۔۔آگ لگا دوں دم بھر میں---------

جس کا تا کا، اس کو مارا۔۔پو بارہ----------پو بارہ----------پو بارہ ہیں

----------پو بارہ ہیں ----------پو بارہ ہیں ----------پو بارہ

ہیں ----------ہرے ہپ ہرے ہپ ۔۔۔ہپ ۔ ہپ ہپ ۔۔

---------شٹ اپ جمیل---------ثریا نے اسے سختی سے ڈانٹا، اور جا کر دریچے کے نیچے رکھے ہوئے دیوان پر بیٹھ گئی۔

یس سر ---------آل رائٹ سر ---------جمشید نے اٹھ کر سلوٹ کیا، اور پھر دراز ہو گیا۔۔۔

مسٹر پیٹرک ڈاک کا پلندہ لے کر اندر آیا۔۔سر کیبل آیا ہے،،شام کی ڈاک میں چٹا گانگ کے دو ضروری لیٹر ہیں۔ذرا دیکھ لیجئے---------

گیٹ اوٹ ----------

سر، خاں برادرز کا ایگریمنٹ ----------مسٹر جانسن کا کیبل موسٹ، ارجنٹ مسٹر پیٹرک نے کہا---------

جمشید نے صوفے پر کھڑے ہو کر الاپنا شروع کر دیا۔

سب کو سیر عجب دکھائی شیریں نے

ادھر تو ہاتھوں میں مہندی لگائی شیریں نے

پھر اس طرف دل کوہ کن میں آگ لگی، اگیا لاگی سندر بن جل گیو رے، سلمٰی میز پر چڑھی بیٹھی تھی، اور گھٹنوں پر سر رکھے فرش کو تک رہی تھی۔جمشید صوفے پر سے کود کر الاپتا ہوا اس کی طرف آ گیا۔

گلال ان کی زلفوں میں پڑا تھا ہو لی میں

جانسن ، صاحب بہادر، آئی ، سی ایس ،، ریٹائرڈ کا کیبل مارو، اور دیکھو،، اگر تم نے ہمارا ٹائم زیاستی خراب کیا، تو ہم تمہاری اتنی ٹھکائی کرے گا، اتنی ٹھکائی کرے گا۔ کہ تم افسوس کرے گا کہ تم پیدا ہوا تھا----------

یہ کہہ کر اس نے کاروباری خطوط کے لفافے کھولے، مسٹر پیٹرک نے فوراً پین حاضر کیا، اس نے خطوط پر سرسری نظر دوڑائی، آنکھ بند کر کے ایک فارم پر دستخط کیے، اور کاغذات زمین پر پھینک دیئے ۔ مسٹر پیٹرک نے لپک کر انہیں اٹھایا، اور ایک لفافہ پیش کیا۔ جس پر ہندوستان کی ٹکٹ اور مہر تھی ۔ اس کے بعد مسٹر پیٹرک باہر چلا گیا ۔ جمشید نے اسی طرح بہکتے ہوئے لفافہ کھولا، اور خط پر نظر ڈالی ، پھر اس کی تیوری پر بل پڑ گئے ۔ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا،

باسمہٖ سبحانہ

متصل درگاہ شریف ،موضع محمد گنج ،تحصیل ہرونی

ضلع سلطان پور، یوپی ۔ مورخہ ۱۴ جون ۱۹۶۱ء

برخوردار سعادت آثار، نورچشمی جمشید میاں سلمہ تعالیٰ،

واضع ہو کہ بتاریخ ۱۲ جون بروز جمعہ بوقت دس بجے شب نور چشمی منظور النساء سلمہا بعارضہ تپ محرقہ راہی ملک عدم ہوئی ۔ ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ،،

مرحومہ کو خانقاہ شریف کے گورستان میں بھائی صاحب جنت آرام گاہ مرقدہ کے متبرک پہلو میں دفن کیا گیا ۔

اس مرحومہ نے مرتے وقت تمہیں معاف کیا، تمہارا خدا بھی تمہیں معاف کرے

،

فقط دعا گو

تمہارا چچا سید مظہر علی عفی عنہ

جمشید نے خط کو مٹھی میں زور سے بھینچا، اور کاغذ کو زور سے مروڑا تروڑا۔ دوبارہ پڑھا ساکت و صامت ہو کر بیٹھ گیا۔

ثریا اور سلمٰی بہت دور کشنوں کے سہارے دیوان پر آڑی آڑی لیٹیں باہوں پر سر رکھ کر سو چکی تھیں۔ باہر رقص ختم ہو چکا تھا، اور مہمانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔

کمرے میں قبرستان کی خاموشی سرسرانے لگی، سنسان خانقاہ کے سارے کواڑ ہوا میں زور سے کھل گئے۔ اور کھڑ کھڑانے لگے۔

ارے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو اتنی لمبی جائداد عطا کرتا ہے۔ صبر کی جائیداد۔ بڑے ابا نے کاکلیں چھٹکا کر نارنجی کفنی سمیٹی، اور اپنے خالی حجرے میں سے جھانکا، کھڑاؤں پہنے اور کھٹ کھٹ کرتے دوبارہ اپنی قبر میں جا گھسے۔ ہوا روئی کے پیڑوں میں سے زور زور سے منڈلانے لگی۔ بہت سرد ہوا تھی۔ اور لو کے جلتے ہوئے تھپیڑوں میں تبدیل ہو گئی۔ شائیں شائیں شائیں شائیں، زدو دوں۔۔ گھوں گھوں گھوں۔۔ جھڑاکے کی بارش شروع ہو گئی، اور کچی قبر پانی میں بھیگنے لگی۔۔ بادل چھٹ گئے۔ چاند نکل آیا۔ سرخ آسمان پر سورج بھی ڈوب رہا تھا۔ اور چاند بھی نکل آیا تھا۔ سہاگن کی قبر ہے۔ جبے رات کو چنبیلی کی ایسی مہک ہے۔ بکریاں ہنکاتی ہوئی چرواہن نے کہا---------- جمشید نے زور سے سسکی بھری۔

تمہارا نشہ ابھی تک نہیں اترا۔ ثریا نے استہزا سے دریافت کیا، اور پھر سو گئی۔

عابد انصاری تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ لاؤنج میں آیا۔۔

منصور، منصور،، اس نے آواز دی۔۔

منصور ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس لئے، دوسرے میں ریسیور اٹھائے ٹیلی فون پر جھکا ہوا تھا، عابد نے اس کے قریب جا کر چاروں طرف دیکھا، اور آہستہ سے کہا۔

منصور قیامت گزر گئی۔۔

منصور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، اور ریسور کو ہاتھ سے چھپا کر آہستگی سے جواب دیا۔

مجھے معلوم ہو چکا ہے۔اس نے ریسیور ایک منٹ تھامے رکھا، پھر فون پر رکھ دیا، اور فرش پر بیٹھ گیا۔

لاؤنج خالی پڑی تھی، عابد ٹیلی فون کی طرف بڑھا، منصور نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا، بے کار ہے۔

پولیس کا اصرار ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے، اور جیل کے حکام کا بیان ہے، کہ پولیس نے اسے تھرڈ ڈگری----------عابد نے چونکنے ہو کر چاروں طرف دیکھا، اور فوراً چپ ہو گیا۔ڈرائنگ روم کے دریچے کا پٹ آہستہ سے کھلا،

لاؤنج میں باتوں کی آواز سے ڈرائنگ روم کے اندر دیوان پر پڑی ہوئی ثریا کی آنکھ کھل گئی۔۔۔اس نے دریچے کا پٹ کھول کر باہر جھانکا۔۔

ہیلو منصور۔۔عابد۔۔یو سو اینڈ سو----------تم لوگ کیا مسکوٹ کر رہے ہو۔

؟

اتنا کہہ کر اس نے پٹ بند کیے اور دوبارہ کشنوں پر گر کر سو گئی۔

لاؤنج میں وہ دونوں فریسکو کے نیچے فرش پر پندرہ بیس منٹ تک بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔

بہت دیر بعد منصور نے آہستہ سے کہا

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہل مصر وضع تکلف تو دیکھیے

عابد نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا۔۔

میں پریس جاتا ہوں۔۔۔

اس خبر کی اشاعت پر چوبیس گھنٹے کی پابندی ہے۔بیٹھ جاؤ،منصور نے جواب دیا ۔اور ہاتھ پکڑ کر اسے فرش پر بٹھا دیا۔

اور قریب میز پر رکھی ہوئی تند شراب کی بوتل گلاس مین انڈیلی اور ایک دفعہ میں گلاس ختم کر دیا۔۔عابد نے دوسرا گلاس بھر کر پینا شروع کیا----------وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا----------

میں جاتا ہوں یہ میرا بہت بڑا اسکوپ ہے۔اس نے دوبارہ کہا----------

منصور نے سر جھکا کر شراب کے بلبلوں کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا،،

ایں۔۔میرا اسکوپ۔۔جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے؟۔

یہ رات،،یہ رات،،اس درد کا شجر ہے۔۔عابد نے بھوں بھوں کرتے ہوئے روتے ہوئے گرہ لگائی،اور فریسکو سے ٹیک لگا کر ایک ہچکی لی۔۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔عابد نے دوسرا گلاس چڑھایا،،

ہم جو تاریک راہوں''اس نے ایک اور ہچکی لی،،واہ،،فیض احمد فیض ''گریٹ مین دی لالٹین۔۔زندہ باد مارے گئے----------

زندہ باد چیرز۔۔۔تمہارا جام صحت۔۔وعلیکم السلام----------

منصور نے کھڑے ہو کر کہا،پھر بیٹھ گیا۔ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔اندر سریلے کلاک نے کوکو کوکو کرنا شروع کیا۔۔آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔۔

کس نے۔۔منصور نے سوال کرنا چاہا مگر چاروں طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔۔

کس نے----------عابد نے ہچکی لے کر پوچھا۔۔

یہ کس نے----------ہچ،،منصور نے تھوڑی دیر بعد دہرایا،،

یہ کس نے لاش پھینک دی----------جوانوں کی ----------راہ میں عابد نے کہا----------

ابھی گزر رہے تھے ہم جوار، رزم گاہ میں----------ہچ---------منصور نے کہا----------

چند یورپین لڑکیاں اپنے سرسراتے ہوئے ایوننگ گاؤن ٹخنوں تک اٹھائے کھلکھلا کر ہنستی ہوئی سامنے سے گزر کر عالیہ کے ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئیں۔

۔

یہ جور و ظلم کی کلائیاں مروڑ کر نکل پڑا۔۔عابد نے کہا----------

اندھیری رات تھی ----------ہچ ----------مگر یہ چل پڑا----------منصور نے کہا----------

جیل کے حکام کا بیان ہے کہ اس کی ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونکی گئیں۔۔۔

ہچ----------عابد نے کہا----------

بیرا چھلکتے ہوئے سرخ پیانوں سے جھلملاتی ہوئی روپہلی کشتی اٹھائے ان کے قریب آیا،،دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، بیرے نے خالی گلاس ان کی کشتی میں رکھے اور نئے گلاس ان کے ہاتھ میں تھما دیے اور چلا گیا۔۔۔

ارے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو اتنی، امی، امی، لمبی جائداد عطا کرت ہے۔

ڈرائنگ روم میں جمشید کی آواز آئی، جو صوفے پر کھڑا ہاتھ ہوا میں لہرا رہا تھا۔

یہ شام غم کا عکس تھا، یہ ایک انتباہ تھا۔ہم اسے کچل نہ دیں، ابھی ----------یہ روندنے کی چیز کیوں بنے، امانت زمین؟----------منصور نے کہا اور جام خالی کر دیا۔۔بتاؤ مسٹر عابد انصاری۔۔۔

کیوں بنے زمیں----------نہیں نہیں۔۔بڑھے چلو کچل بھی دو، اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔۔

کچل بھی دو۔۔ہچ----------خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش----------یہ موت کا مجسمہ ڈرا رہا ہے دیر سے۔۔لہو میں تر بتر ہے سر سے پاؤں تک، جمے ہوئے خون

میں ہے میرے ہی لہو کی مہک،،

مہک۔۔۔اس نے اتنے زور سے گرج کر کہا، عابد اچھل کر کھڑا ہو گیا، اور اس سے زیادہ گرج کر بولا،

،،یہ میرا اسکوپ ہے۔۔میں کہے دیتا ہوں----------یہ میرے کیریر کا سب سے بڑا اسکوپ ہے۔

وہ لاؤنج سے نیچے کیاریوں میں پھلانگا اور گھاس کے قطعے پر سے لڑکھڑاتا، دوڑتا، کرسیوں سے ٹکراتا۔ جہاں اب اکا دکا مہمان ادھر ادھر نشے میں لڑھک رہے تھے۔ وہ تیزی سے پھاٹک تک پہنچا اور ثریا کی نیلی فوکس ویگن میں بیٹھ کر زناٹے سے اپنے اخبار کی سمت روانہ ہو گیا۔۔

منصور نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور سر ہلا کر کہا۔۔

عابد میاں میں تمہارے آنے سے پہلے ہی اپنے اخبار کو فون کر چکا ہوں۔۔

اس کے بعد اس نے کیاری میں چھلانگ لگائی اور سر جھکائے ہوئے کیکڑے کی طرح ترچھا ترچھا چلتا تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ثریا نے جاگ کر آنکھیں ملیں، اور سلمیٰ کا بازو ہلایا۔۔

،،اٹھو سلمیٰ۔۔کیا رات بھر یہیں سونے کا ارادہ ہے۔

،،ہمیں سونے دیجئے۔ثریا باجی ہم بہت تھک گئے ہیں،، سلمیٰ نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔۔

جمشید صوفے پر سے کود کر لڑکھڑاتا ہوا لڑکیوں کی طرف آیا، اور سلمیٰ کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ کر پوچھا۔۔

پری بی----------ذرا یہ تو بتاؤ کہ جان من تمہاری ثریا باجی کس طرح ہیں۔۔ کیوں کر ہیں---------- کدھر سے ہیں۔۔ایں،،

سلمیٰ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور جمشید کو پوری قوت سے پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے

شدید کراہت کے ساتھ کہا۔

KEEP AWAY YOU DIRTY DOG (کیپ اوے یو ڈرٹی ڈاگ؟

کیا کہا پری بی۔؟ میں ڈرٹی ڈاگ ہوں، اور تم کیا ہو،، یو ڈرٹی بلڈی بچ۔

ثریا آگ بگولا ہو کر اٹھی۔ اس نے جمشید کے منہ پر اپنی پوری قوت سے ایک طمانچہ رسید کیا۔۔۔

جمشید علی سید! تم کتنے ہی نشے میں کیوں نہ ہو،، مگر تم نے میرے سامنے چھوٹی بٹیا کی توہین کی تو میں تمہارے دانت توڑ دونگی۔۔۔ تمہارا خون کر دوں گی۔۔۔

آہاہاہا۔۔۔ اوہوہو ہو ---------- یک نہ شد دو شد۔۔۔ چھوٹی بٹیا، یہ آپ کی چھوٹی بٹیا ہیں۔۔۔ آپ ان کی اماں جان ہیں، والدہ محترمہ، چہ خوش چرا نہ بودی۔۔ ۔ چھپر پر بھینس کودی۔۔ آج کی رات بڑے بڑے انکشافات ہوتے رہے ہم پر ----------چودہ دونی آٹھ ئیس طبق روشن ہو گئے،، پھر اس نے زور کی تان لگائی ۔۔ آج کی رات۔۔۔ آج کی رات---------- سازو ورنہ چھیڑ ----------اور دیوان کے قریب قالین پر دھم سے بیٹھ گیا۔۔

سلمیٰ تھر تھر کانپ رہی تھی۔۔۔ وہ ثریا سے لپٹ گئی۔۔۔ جیسے اس کی پناہ لیتی ہو

۔۔۔

ثریا دفعتاً ہوش میں آ گئی، اور اس نے آہستہ سے جمشید کو مخاطب کیا----------

جمشید سلمیٰ تمہارے دفتر میں چار مہینے سے کام کر رہی ہے۔ اور تم کو یہ معلوم نہیں، کہ یہ کون ہے، کس کی بیٹی ہے؟

مجھے موصوفہ کا شجرہ نسب اور ہسٹری شیٹ معلوم کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ۔۔۔ ان کے ذاتی فائیل سے میر اوزیر باتدبیر مسٹر پیٹرک ڈیل کرتا ہے۔

مجھے صرف اس سے یہ غرض ہے، کہ یہ میری نوکر ہیں، اور میرے کلائنٹس کی محبوبہ

دل نواز ---------- مس چھپن چھری ۔ ۔ ۔ ارے اس نے پھر لہکنا شروع کیا----------

ارے ایسے تو جگ میں جوان کوئی ہوئیو نا ---------- ارے دس گنڈا آگے ---------- دس گنڈا پیچھے ---------- ایسے تو ----------

ثریا نے طیش سے بے قابو ہو کر اسے تین چار تھپڑ اور لگائے ، اس نے بازو چہرے کے سامنے کر کے ثریا کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی ---------- سلمٰی نے لرزتے ہوئے ثریا کو اپنی طرف کھینچا۔۔۔

ثریا باجی ۔۔۔ خدا کے لئے ۔۔۔ ثریا باجی ۔۔۔

ثریا چیتے کی طرح چلتی ہوئی پھر جمشید کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ۔۔

ہاں جمشید علی سید آج کی رات یقیناً انکشافات کی رات ہے۔

وہ ثریا کے تیور دیکھ کر بے طرح خوف زدہ ہو گیا ۔ ۔ ۔ ڈارلنگ ہمیں مارو نہیں ---------- ہمیں دانٹو نہیں ---------- اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔

پنجرے میں مقید شیرنی کی مانند چاروں طرف گھوم کر ثریا نے کہنا شروع کیا۔۔

۔

جمشید علی سید ۔ ۔ ۔ آج پہلی مرتبہ میری ملاقات کھانے کی میز پر تمہارے والد صاحب سے ہوئی ، اور میں نے ان کو فوراً پہچان لیا ---------- محمد گنج میں وہ ابا سے ملنے ہمارے گھر اکثر آیا کرتے تھے۔

جمشید کا رنگ فق ہوتا دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا ۔ ۔ ۔

جمشید صاحب میں کسی تعلقہ دار کی صاحبزادی نہیں ہوں ، میں نے کسی مسوری کانونٹ میں تعلیم نہیں پائی ۔ میں نے کسی شانتی نکیتن کی شکل نہیں دیکھی ۔ میں سید زوار حسین مرحوم سوزخواں و کاشت کار ، موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کی لڑکی ہوں ، تم کان پور کے کسی مشہور ایڈووکیٹ کے بیٹے نہیں ہو ، تم سید مظہر علی کاشت کار موضع محمد

گنج ضلع سلطان پور کے بھتیجے ہو، اور تم نے کسی کرنل براؤن اسکول ڈیرہ دون میں تعلیم حاصل نہیں کی۔۔۔تم اور میں ----------ہم دونوں اپنے پبلک ریلیشنز ایکسپرٹ کے تخلیق کردہ کردار ہیں ----------زندہ باد منصور احمد خاں۔۔۔میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔

وہ فرش پر بیٹھ گئی۔۔۔جمشید خاموشی سے اٹھا، اور بار سے دو گلاس بنا لایا۔۔۔

آؤ----------ہم دونوں اپنے عزیز پریس ایجنٹ منصور احمد خاں کا جام صحت پئیں---------ثریا نے بڑی سنجیدگی سے اپنا گلاس جمشید کے گلاس سے ٹکرایا---------جمشید نے وحشت زدہ ہو کر اسے دیکھا،

بوٹا بیگم، آتو جی کی لڑکی۔۔۔بسنتی بیگم۔۔۔

وہ کہتی رہی۔۔۔

تمہارے چچا ابا سید مظہر علی نے کفن سر پر باندھ کر اپنی آقا نواب شمس آرا بیگم کے خلاف گواہی دی تھی، اور مجھے میاں نوروز کے چنگل سے چھڑایا تھا۔وہ میرے محافظوں میں سے تھے۔وہ تمہارے بھی محافظ فرشتے تھے، مگر تم نے ان کو بھی نہ پہچانا، اور ان کی قدر نہ کی۔۔۔

چھوٹی بٹیا کے بابا مرزا قمر الدین نے مجھے آسرا دیا تھا، وہ بھی نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کے قائل تھے۔۔۔وہ میرے دوسرے محافظ فرشتے تھے۔۔۔میرا تیسرا محافظ فرشتہ منصور احمد خاں ہے۔۔۔اور میری آخری جائے پناہ سوئٹزرلینڈ کے وہ بنک ہیں، جن میں تمہاری دولت جمع ہے---------آؤ تمہارے سوئس اکاؤنٹ کا جام پئیں۔

اس نے گلاس دوبارہ ٹکرایا، اس نے دو سال پیرس میں رہ کر بھی اتنی شراب نہ پی تھی۔۔۔جتنی وہ صبح سے شام تک پی چکی تھی۔

جمشید نے وحشت زدہ ہو کر سلمیٰ کو دیکھا، جو بچوں کی طرح ہاتھوں کی مٹھیاں بنا

کر اپنی آنکھیں مل رہی تھی، اور ثریا کی ساڑھی کا آنچل پکڑے اس کی آڑ میں دبکی اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

کہر آلود آم کے باغ میں گرم روشن خیمے کے اندر ایک چھوٹی سی بچی نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں تھینک یو کہا----------

کمرے میں لرزہ خیز سکوت طاری تھا۔۔۔دونوں آشفتہ حال۔۔۔ بے سہارا لڑکیاں محمد گنج کے مندر کی سیتا کی مورتیوں کے مانند اس کے سامنے بیٹھی تھی۔وہ ان کے سامنے دوزانو جھک گیا، اور اس نے آہستہ آہستہ کہا۔۔

میری منظور یا نے مجھے مرنے سے پہلے معاف کر دیا، ثریا، سلمٰی، تم دونوں بھی مجھے معاف کر دو،

کے سیرا ----------سیرا۔۔۔ دوسری منزل سے نغمے کی آواز بلند ہوئی----------اور رات کے گہرے سناٹے میں گونجی، اوپر ابھی پارٹی جاری تھی، اور فیری کے کسی بوائے فرینڈ نے ریڈیو گرام پر ڈورس ڈے کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔۔۔

جمشید دفعتاً اپنی جگہ سے اٹھا، اور زینے میں جا کر بڑے زور سے دہاڑا۔۔

اری او فرحتیا۔۔۔بلا بند کر----------وہ اس زور سے چیخا کہ سارے جمشید ہاؤس میں اس کی آواز سنائی دی، فری نے گھبرا کر اوپر سے جھانکا، اور ڈیڈی کی آواز اور اس لہجے سے بے حد متعجب ہوئی----------ڈیڈی نے آج تک اسے اس گنوار و نام سے نہیں پکارا تھا۔۔۔

وہ آ کر پھر فرش پر بیٹھ گیا۔۔۔

سرہانے کلاک نے رات کا دو بجایا،،

ثریا نے آنکھیں میچ لیں اور چپکے چپکے کہا۔۔۔سلمان----------تم بھی مجھے معاف کر دو ----------تم جہاں کہیں بھی ہو، جس حالت مین بھی ہو----------مجھے معاف کر دو۔۔مجھے معاف کر دو۔۔۔مجھے اس طرح نہ مرنے

دو---------سلمان۔۔۔

کمرے میں ایک بار پھر قبرستان کی سی خاموشی سنسنانے لگی۔۔جمشید اسی طرح سر پکڑے بیٹھا رہا۔جیسے وہ گورکن ہو،اور بہت سی میتیں دفنا کر آیا ہو۔اور اب سستا رہا ہو۔

اگیا لاگی سندر بن جل گیورے۔۔۔اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں دہرایا،اور گلاس کی باقی ماندہ شراب ختم کرنے کے بعد اپنی آنکھوں پر ہتھیلی پھیری،اور پھر دل دوز نیچی آواز میں آہستہ آہستہ الاپنا شروع کیا۔۔۔

جلی ہے لاش میری آتش جدائی میں
مدد کو پہنچو صنم اب کفن میں آگ لگی

پھر اس نے کہا---------

بسنتی بیگم۔۔۔تمہیں ہمارے گاؤں کا چپاتی بھانڈیا دہے،جو یہ خمسہ گایا کرتا ہے

ثریا اس کے نزدیک اکڑوں بیٹھ گئی،اور آواز ملانے لگی۔

مدد کو پہنچو صنم اب کفن میں آگ لگی---------

کچھ دیر بعد ثریا نے چیخ کر دہرایا۔۔۔

پھر وہ دونوں یک لخت چپ ہو گئے۔۔۔سلمٰی خاموشی سے سر جھکائے قالین کو تکتی رہی---------ثریا نے ایک سانس میں متواتر دہرانا شروع کیا۔۔

پل نہ لاگیں موری اکھیاں پو پل نہ لاگی میری انکھیاں---------پو پل نہ لاگی میری انکھیاں،،پل نہ،،پل نہ---------سلمٰی نے گھبرا کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

ثریا باجی،ثریا باجی۔۔۔لیٹ جایئے---------پانی پی لیجیئے---------

میں بالکل ٹھیک ہوں،چھوٹی بٹیا۔۔۔اس نے جواب دیا---------

اور ساڑھی کے آنچل سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ پونچھا، مگر آنسو اس کی آنکھوں سے امڈا گیا۔۔ پھر وہ دھیرے سے بولی،، جمشید ---------- مجھے بھی چپاتی بھانڈ کا ایک گانا یاد ہے، سناؤں ---------- پھر اس نے دل کو ٹکڑے کر دینے والی آواز میں کہا ---------- دن کو آ سکتے نہ تھے ۔۔۔ آنے کو کیا رات نہ تھی ---------- مہندی پاؤں میں نہ تھی آپ کے ---------- برسات نہ تھی ---------- کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی ۔۔۔ سچ تو کہیے منظور ملاقات نہ تھی ---------- منظور ملاقات نہ تھی ----------

پھر وہ دفعتاً بالکل خاموش ہوگئی، اور دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔۔۔

وہ تینوں شکستہ جاموں، بکھری ہوئی بوتلوں، فرش پر بہتی ہوئی شراب اور ٹوٹی ہوئی تپائیوں کے انبار پر اس طرح سر جھکائے بیٹھے رہے، جیسے دنیا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور وہ جلے ہوئے کرہ زمین کے آخری جاندار ہیں۔۔۔

دھڑ سے دروازہ کھلا، اور سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی گھاسلیٹ والا اندر داخل ہوا ،اور انہوں نے آگے بڑھ کر ایک اسٹامپ پیپر جمشید کی ناک کے سامنے لہرایا۔۔

چٹا گانگ سے ٹرنک کال آگیا ، زمشید بھائی ۔ ۔ ۔ ادھر سائین کردو ---------- ہم کو گھر جانے کا ہے ----------

جمشید نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا ---------- آنکھیں ملیں، اور اسے رفتہ رفتہ یاد آیا کہ وہ کون ہیں ---------- پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے پوری طرح آنکھیں کھولیں، اور اپنے آپ پر نظر ڈالی۔ اور اسے یاد آگیا کہ وہ خود خون ہے۔۔۔ وہ مشہور بزنس مین جمشید علی سید بزنس میگنیٹ تھا۔ آج شام اس کی شاندار کوٹھی میں ہاؤس وارمنگ

ہوئی تھی۔۔ یہ کوٹھی اس نے ساڑھے چار لاکھ میں بنوائی تھی۔ اس کے سارے کمرے ایر کنڈیشنڈ تھے، جو ایک دوسرے سے ہاؤس ٹیلی فون سے منسلک تھے۔ شہر

کے خوش پوش ترین انسانوں میں اس کا شمار کیا جاتا تھا۔اور اعلیٰ طبقے کی بیشتر بن بیاہی لڑکیاں بیگم جمشید کہلانے کی متمنی تھیں۔۔۔آج صبح اس نے دس لاکھ کا معاملہ طے کیا تھا، اور اس کے لئے مسٹر جانسن کے کیبل کا اسے جواب دینا تھا۔اس کے بعد چٹا گانگ ٹرنک کال کرنا تھا۔اور اس کے بعد نئے کام کے سلسلے میں ایک جرمن فرم سے گفتوشنید کے لئے کل تیسرے پہر کو یورپ روانہ ہونا تھا۔۔۔اس نے ایک لمبا سانس لیا، سگرٹ جلایا۔۔۔اور مسٹر گھاسلیٹ والا کے ساتھ اپنے آفس روم کی طرف چلا گیا۔۔۔

اب صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے، مسٹر پیٹرک ڈرائنگ روم میں آئے، اور انہوں نے سلمٰی کو مخاطب کیا۔

مس مرزا۔۔۔بوس وانٹس یو----------

سلمٰی قالین پر سے اٹھی، بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا، اور مضبوط قدم رکھتی آفس روم میں آ گئی۔۔۔

مس مرزا----------

یس سر ----------

آپ کو اتوار کے دن بھی زحمت دینا پڑ رہی ہے۔کل نو بجے صبح مسٹر ولکاکس اور ان کا گروپ بی، او، اور اے سی سے آ رہا ہے، ساڑھے نو بجے وہ دونوں جاپانی پہنچ جائیں گے۔۔صبح کو ایر پورٹ چلی جایئے۔اور ان لوگوں کے لئے میٹروپول میں کمرے بک کرا دیجیئے۔اور دوپہر کو لنچ کھلا دی جیئے۔

بوس نے نظریں نیچی کیے کیے اس سے کہا۔۔

میں خود نہ آسکوں گا، کیونکہ فلائی کرنے سے پہلے مجھے بہت سے کام نپٹانا ہیں۔ کل دس بجے تک میٹروپول پہنچ جایئے گا۔

یس سر۔۔۔سلمٰی نے سیدھی کھڑی ہو کر نارمل اور باہمت آواز میں جواب دیا۔

--

گڈ نائٹ ۔۔۔

گڈ نائٹ ۔ ۔ ۔مسٹر پیٹرک ---------- قادر بخش کو بولو ، مس کو گھر پہنچا دے ----------

سلمیٰ کمرے سے باہر چلی گئی ۔۔۔

مسٹر پیٹرک پھر ڈرائنگ روم میں گئے ۔۔۔

مس حسین --------- مسٹر سید نے بلایا ہے ----------

ثریا قالین پر سے اٹھی ، بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا، اور مضبوط قدم رکھتی آفس میں گئی ۔

ثریا --------- جمشید نے نظریں اٹھائے بغیر کہا --------- شام کو تمہارا ٹکٹ بھی آ گیا ہے ۔گھر جا کر پیکنگ کر لو، کل ڈھائی بجے ایر پورٹ آ جانا، ابھی پیرس سے کیبل آیا ہے ۔تمہاری نمائش کا انہوں نے ۱۸ جولائی سے انتظام کیا ہے، اتنا عرصہ ہم لوگ جینوا میں رہ سکیں گے --------- اچھا کل ملاقات ہو گی ---------- گڈ نائٹ ثریا ----------

گڈ نائٹ --------- وہ بھی باہر چلی گئی ۔۔۔مگر چند منٹ بعد اس نے واپس آ کر کہا --------- میری کار غائب ہے ۔۔۔شاید منصور یا عابد لے گئے ۔۔۔۔

مسٹر پیٹرک ،، فتح گل کو بولو ۔۔۔عالیہ بی بی کی کار میں مس صاحب کو گھر پہنچا دے ۔۔۔

۔۔۔یس سر ۔۔۔

دوسرے روز غیر ملکی مہمانوں سے نپٹ چکنے کے بعد سلمیٰ نے میٹرو پول کی دوکانوں سے بہت سا سامان خریدا، قیمتی چاکلیٹ، ٹافی ،بسکٹوں کے ڈبے خشک میوہ

۔۔۔شیرے میں ڈوبے ہوئے پھلوں کے ڈبے---------تھری کاسلز کا پورا کارٹن، ایکوا، ویلوا اور شیمپو کی شیشیاں، بڑھیا قسم کا شیونگ سوپ، ٹوتھ پیسٹ، بل سٹال سے بہت سے پیپر بکس، کتابیں اور تازہ رسالے لیے اور گھر آ گئی، ماما کو ایک ایک چیز دکھائی، اور رات کے کھانے کے بعد سب چیزوں کا بڑا سا پارسل بنایا۔ پارسل کو سرہانے رکھا، اور اس پر ہاتھ رکھ کر سو گئی۔

ایک صاحب کے ذریعے وہ ہر پندرہ روز بعد سلمان کو ایک پارسل بھجوایا کرتی تھی۔ وہ صاحب گھر سے لے جایا کرتے تھے۔ مگر پچھلی مرتبہ انہوں نے کہا تھا کہ اس دفعہ وہ خود نہ آ سکیں گے، سلمٰی نے ان سے کہا تھا کہ وہ پیر کی صبح کو وہ سامان خود ان کے پاس پہنچا دے گی۔

صبح کو وہ پارسل دفتر لیتی گئی، اور اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان صاحب کا فون نمبر دیکھنے کے لئے ٹیلی فون دائریکٹری کھولی۔ اتنے میں مسٹر پیٹرک اندر آئے، اور انہوں نے ایک لفافہ سلمٰی کو دیا۔۔۔

بوس کا خط۔۔۔انہوں نے کہا اور باہر چلے گئے، مس ڈی سوزا آئیں اور چند کاغذات کرسی پر رکھ کر باہر چلی گئیں۔

چھوٹی بٹیا پرسوں رات انتہائی نشے کی حالت اور نیم دیوانگی کے عالم میں میں نے جس طرح آپ سے گستاخی کی، اس کے لئے دل سے معافی کا خواستگار ہوں، اور جانتا ہوں کہ معاف کیے جانے کا مستحق نہیں، میری رذالت کے باوجود بھی آپ نے اسی تمکنت اور بردباری سے میرے حکم کی تعمیل کی، اور آج میرے لئے میزبانی کے فرائض انجام دیئے، پرسوں رات جب میں نے دفتر کی میز پر بیٹھ کر آپ سے ایر پورٹ اور میٹرو پول جانے کے لئے کہا تھا، اس وقت میں آپ کے لئے ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اس ملازمت کے لئے جو سراسر آپ کی شخصیت کی توہین اور آپ کے وقار اور شرافت کے منافی ہے، آپ کو مزید زحمت نہیں دے

ہوں۔ یہ دنیا بری ذلیل جگہ ہے۔ میں بھی اس دنیا کا ایک فرد ہوں، آپ کے بھائی نے سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا، اور اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے بہت جلد معلوم ہو چکا ہو گا کہ یہ آئیڈئل ازم اور انتہا پسندی قطعاً غلط ہے۔ آپ نے اپنے حالات اور مجبوریوں کے تحت میرے ذریعے اس دنیا سے سمجھوتہ کر لیا۔ جس طرح ثریا نے میرے ذریعے سمجھوتہ کر کے سورج کے نیچے اپنی جگہ بنا لی۔ مجھے یقین ہے کہ قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے اسے شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا ہو گا۔ مگر اسے معلوم ہو چکا ہے اور آپ بھی جانتی ہیں کہ دنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے، جس میں ذہنوں، دماغوں، روحوں اور دلوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فن کار، دانش ور، غیب پسند اور خدا پرست میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں۔ میں خود ان کی اکثر خرید و فروخت کرتا ہوں۔

میں یہ سب باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر بڑی ہو جائیں، اور زندگی کی طرف سے مزید الوژن اور خوش فہمی آپ کے دل میں باقی نہ رہے، ورنہ مرتے دم تک آپ کو صدمے اٹھانا پڑیں گے۔ آپ زندگی سے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیں اور زندگی کے مکر و فریب اور کاروباری اور کمینے پن کا مقابلہ ان ہی ہتھیاروں سے کریں، دنیا میں زیادہ تر انسان جنگل کے درندے ہیں، اور ہمیں جنگل کے قانون کا ساتھ دینا ہے،، مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ آپ اپنی موجودہ ملازمت سے کس قدر دہشت زدہ تھیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ جلد از جلد زندگی کی دہشت پر قابو پا لیں۔

میں یہ خط آپ کو ایر پورٹ سے لکھ رہا ہوں۔ میں اور ثریا مہینے بھر کے لئے یورپ جا رہے ہیں، اور ہم دونوں کی خواہش ہے کہ واپسی پر آپ کو خوش و خرم اور بخریت پائیں۔۔۔

آخر میں میرا ایک اور بزرگانہ مشورہ ہے، کہ اب آپ کو شادی کر لینا چاہیئے۔

میں لوٹتے ہی کوشش کرونگا کہ واپس آتے ہی آپ کو ہاؤسنگ سوسائٹی میں معقول کرائے کا فلیٹ لے دوں ----------

والدہ صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام کہیے گا، میری پرخلوص دعائیں آپ کے ساتھ ہیں،

خدا حافظ

آپ کا کم ترین جمشید

سلمٰی کے ہاتھ سے خط گر گیا---------- نیچے کرسی پر صبح کا اخبار رکھا تھا، جس کے پہلے صفحے پر جلی سرخی میں منصور احمد خاں کا اسکوپ چھپا تھا---------

---------- THE END ----------